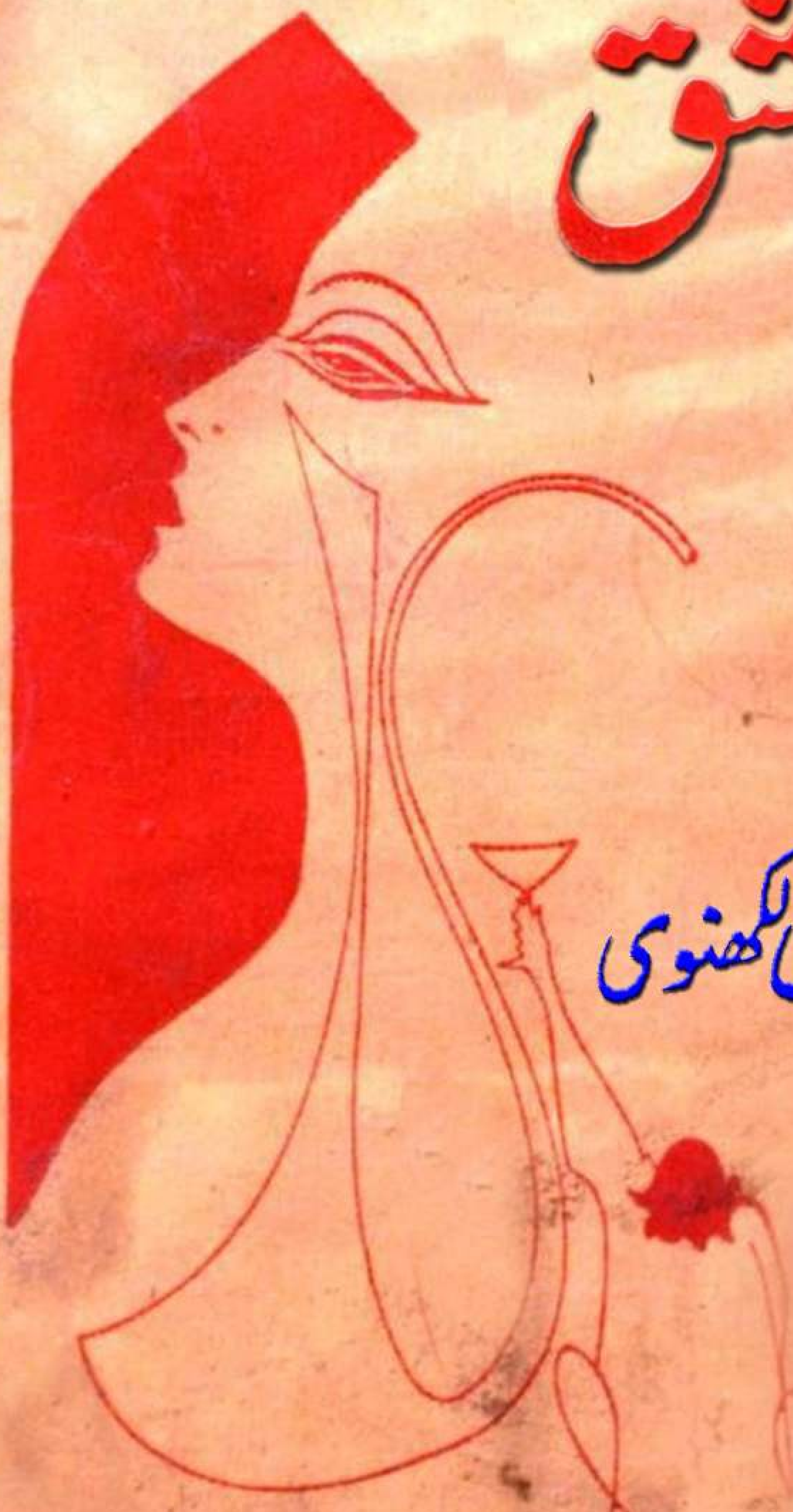
مثنوی

# زہرِ عشق

نواب مرزا شوق لکھنوی



# ترتیب

# مرزا شوق لکھنؤی

## عہد، غزل گوئی اور واسوخت نگاری

ڈاکٹر رابعہ مبین

ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی ۶

**نام :** — والدین کا رکھا ہوا نام تصدق حسین تھا۔ نواب مرزا عرفیت تھی۔ پیشہ طبابت اور علم طب سے واقفیت کی بنا پر حکیم کا سابقہ بھی نام کے ساتھ لگایا جاتا ہے۔ "فریب عشق" میں شوق نے اپنی عرفیت کی جانب یوں اشارہ کیا ہے:

نام جس وقت میں نے بتلایا　　قہقہہ مار کر یہ فرمایا
اے لو میں بھی کہوں سبب کیا ہے　　ارے تو ہی نواب مرزا ہے

تذکرہ ''خوش معرکہ زیبا'' کے مولف سعادت علی خاں ناصر نے شوق کو بے تخلص قرار دیا ہے(۱) جو غلط ہے۔ شوق ان کا تخلص تھا ان کی غزلوں کے مقطعے میں تخلص کا استعمال ہوا ہے۔ مثال کے طور پر ان کے یہ دو شعر:

نظارہ کیا شوق نے اس چشم کا جب سے
نرگس پہ پڑی آنکھ نہ آہو پہ پڑی آنکھ

پھر شوق سے کیا اس بت عیار سے بگڑی
ہوتے نہیں باہم جو اشارے کئی دن سے

گویا تخلص ندارد نہ تھا بلکہ شوق ان کا تخلص تھا۔ لکھنو جائے پیدائش ہونے کی وجہ سے لکھنوی کہے جاتے تھے۔ ''تذکرۂ شوق'' کے مصنف نے انہیں نسباً پٹھان لکھا (۲) ہے۔ لیکن ''حیات شوق'' کے مصنف بتایا ہے:-

''درحقیقت شوق پٹھان نہیں بلکہ مغل تھے اور اس لحاظ سے یہ لوگ مرزا کہلاتے تھے۔'' (۳)

**پیدائش** : شوق لکھنو میں پیدا ہوئے۔ تاریخ پیدائش معلوم نہیں۔ ''تذکرۂ شوق'' کے مصنف نے ''اودھ اخبار'' کے حوالے سے لکھا ہے:-

''شوق کی تاریخ پیدائش معلوم نہیں۔ مگر ''اودھ اخبار'' میں، جو نول کشور

---

(۱) ''تذکرہ خوش معرکہ زیبا''، سعادت خاں ناصر، مرتبہ: شمیم انہونوی

(۲) ''تذکرہ شوق''، عطاالله پالوی، صفحہ ۲۱

(۳) ''حیات شوق'' ڈاکٹر سید محمد حیدر، صفحہ ۲۳

پریس سے ۱۸۵۱ء میں جاری ہوا تھا۔تاریخ ولادت اور عمر بہ وقت وفات درج ہے۔اس سے معلوم ہوتا ہے کہ شوق ۱۱۹۷ھ/۱۷۸۰ء میں لکھنو میں پیدا ہوئے۔"(۱)

ڈاکٹر شاہ عبدالسلام نے ۱۷۸۰ء کے بجائے ۱۷۸۳ء لکھا ہے۔تقویم کی رو سے یہی صحیح ہے۔

**خاندان** :۔ حکیم نواب مرزا شوق کے خاندان کے بارے میں عطاء اللہ پالوی نے لکھا ہے کہ:۔

"حکمت میں یہ خاندان بہت ہی مشہور تھا۔شوق کے والد آغا علی خاں اور چچا مرزا علی خاں لکھنو کے مشہور اطبا میں شمار کئے جاتے تھے۔حکیم مرزا علی خاں شاہان اودھ کے دربار میں بڑے مرتبے پر فائز تھے اور انہیں 'حکیم الملک' کا خطاب بھی حاصل تھا۔ان کے بعد اس عہدے پر ان کے بیٹے حکیم مسیح الدولہ کو جگہ ملی اور وہ اس عہدے پر مدت العمر قائم رہے۔"(۲)

"حیات شوق" کے مصنف نے نواب مرزا شوق کے خاندان کی مزید تفصیلات فراہم کی ہیں۔ان کے مطابق اس خاندان کے جد اعلیٰ مرزا افضل حسین اصفہانی تھے۔یہ خاندان اصفہان سے ہندوستان آیا تھا۔حکیم نواب مرزا شوق کے چچا زاد بھائی حکیم مسیح الدولہ کا ذکر اوپر ہوا۔مشہور شاعر و ادیب مرحوم جعفر علی خاں اثر کا تعلق انہیں کے خاندان سے تھا۔ان کا مجموعہ کلام "اثرستان" ہے۔اس مجموعہ کے مقدمہ میں عزیز لکھنوی نے اس

---

(۱)"تذکرۂ شوق"،عطاء اللہ پالوی،صفحہ ۳۹

(۲)"تذکرۂ شوق"،عطاء اللہ پالوی،صفحہ ۴۰

خاندان کی جو تفصیل فراہم کی ہے اس سے مسیح الدولہ کے توسط سے حکیم نواب مرزا شوق کے خاندان پر کچھ روشنی پڑتی ہے۔ عزیز لکھنوی مقدمہ میں لکھتے ہیں:-

''مرزا علی خاں حکیم الملک ابن مرزا ابجو د متخلص بہ ذرہ ابن حکیم مرزا محمد شفیع اصفہانی اس طرح سلسلہ نسب مالک اشتر تک منتہی ہوتا ہے جو خاص صحابی حضرت امیر المومنین علی ابن ابی طالب کے تھے۔ مرزا شفیع اصفہان سے ہندوستان آئے اور کچھ دن اکبر آباد میں مطب کیا۔ نواب شجاع الدولہ بہادر نے دار الشفا میں عہدۂ طبابت پر ممتاز کیا۔''(۱)

''تذکرۂ ہندی'' میں مصحفی نے مرزا شفیع کو مرزا وصی چھوٹا بھائی بتایا ہے(۲)

''حیات شوق'' کے مصنف کی تحقیق کے مطابق مرزا شفیع کے تین بیٹے تھے۔ مرزا ابجود، مرزا رفیع اور مرزا رضا علی آشفتہ۔ مرزا ابجود کا اصل نام حکیم مرزا مسیح تھا۔ ذرہ اور سبیہ تخلص کرتے تھے۔ طبابت کے علاوہ شعر و شاعری سے بھی دلچسپی تھی۔ ''مقدمہ اثرستان'' کے مطابق نواب شجاع الدولہ کی وفات کے بعد مرزا ابجود مع اہل وعیال کربلائے معلی چلے گئے اور وہیں گیارہ برس کے قیام کے بعد انتقال فرمایا اور محراب قبہ میں مدفون ہوئے۔ مرزا رفیع بریلی کی طرف کہیں جا کر رہنے لگے۔ مرزا رضا علی آشفتہ لکھنو سے مرشد آباد گئے۔ نواب مرشد آباد کے دربار سے وابستہ ہوئے۔ نواب کے انتقال کے بعد ان کے جانشینوں سے تعلقات کشیدہ ہو گئے۔ چنانچہ وہ کلکتہ آ گئے۔ آشفتہ حکیم کے علاوہ شاعر بھی تھے۔ ان کا ذکر کئی تذکروں میں ملتا ہے۔ ''تذکرۂ گلشن سخن'' مصنف: مردان علی خاں، ''تذکرۂ خوش

---

(۱) ''مقدمہ اثرستان''، عزیز لکھنوی، صفحہ ۳

(۲) ''تذکرۂ ہندی''، مصحفی، صفحہ ۵۳

معرکہ زیبا'' مصنف: سعادت خاں ناصر، '' تذکرہ ہندی'' مصنف: مصحفی اور '' تذکرہ سرور'' مصنف: نواب اعظم الدولہ میر محمد خاں سرور نے ان کا ذکر اشعار کے حوالے سے کیا ہے۔ آشفتہ کے بارے میں مصحفی رقم طراز ہیں:۔

'' آشفتہ تخلص کہ مرزا رضا قلی نام دارو پسر حکیم محمد شفیع برادر خورد مرزا رضی جوانیست شوریدہ سر وارستہ مزاج باوصف آشنائی فن طبابت کہ موروثی مست چوں دیگراں دوکاں خود فروشی نمی چنید۔ در طرز گفتن وخواند شعر بشاگردی وتتبع میر سوز مناخرت می کند والحق کہ وقت روانی زباں ہر کافتن از مردم سامعین دل فریبھائی می نماید (شعر دردمندانہ رابسیار دوست می دارد) درآیا لیکہ فقیر از شاہ جہاں آباد در لکھنو آمدہ اول طرح مشاعرہ اوانداختہ۔''(۱)

'' تذکرہ سرور'' کے مولف نے لکھا ہے:۔

'' درفن طبابت مہاتے دارد وشعر ریختہ ہم می گوید شوریدہ سر وراز شقہ مزاج مست واسفارش دلچسپ۔ در لکھنو بہ خانہ خود مجلس مشاعرہ منعقد می کرد۔''(۲)

گویا آشفتہ دہلی سے لکھنو آئے۔ شعر و شاعری میں دلچسپی لی۔ اپنے گھر پر مشاعرہ کیا کرتے۔ میر سوز کے شاگرد تھے اور اس شاگردی پر مفاخرت بھی کرتے تھے۔ ان کے اشعار دلچسپ تھے، دردمندانہ تھے۔ پھر ۱۲۰۸ھ میں لکھنو سے مرشد آباد گئے اور چھ برس کے قیام کے بعد ۱۲۱۴ھ میں کلکتہ چلے گئے۔ '' تذکرہ بزم سخن''، '' تذکرہ طبقات شعرائے ہند''، '' تذکرہ سخن شعراء'' اور '' تذکرہ خوش معرکہ زیبا'' کے مطابق وہ ملول کے شاگرد تھے۔

---

(۱) '' تذکرہ ہندی''، مرتبہ: ڈاکٹر اکبر حیدر کاشمیری، صفحہ ۵۲

(۲) '' عمدہ منتخبہ یعنی تذکرہ سرور''، مرتبہ: ڈاکٹر خواجہ احمد فاروقی، صفحہ ۸۸

ڈاکٹر سید محمد حیدر نے مختلف تذکروں سے ان کے چند اشعار نقل کئے ہیں۔ذیل میں ان اشعار کو پیش کیا جاتا ہے:

دم آخر جو ہچکی آتی تھی وہ فراموش کار تھا دل میں

ہمیشہ آگ نکلتی ہے میرے سینے سے
الٰہی موت دے گزرا میں ایسے جینے سے

چہرے کچھ ان دنوں غم پنہاں سے زرد تھے
ظاہر میں کچھ مرض نہیں پر دل میں درد تھے

چلا ہے کعبہ کو آشفتہ پارسا بن کر
خدا جو بیٹھے بٹھائے اسے خراب کرے

وہ رشک مہر جو عالم میں بے نقاب پھرے
پھر اس چمک سے نہ گردوں پہ آفتاب پھرے

گئے تھے کل مجھے بھلا کے میں یہ آتا ہوں
میں ایسے آنے کے صدقے بہت شتاب پھرے

یہ جوش غم ہے کہ سینہ میں خوں ابلتا ہے
نہ رکھیو ہاتھ کلیجے پہ میرے جلتا ہے

لڑنے کو رات اس سے میں غصے میں لڑ گیا
پر جب وہ اٹھ چلا تو کلیجہ پکڑ لیا

شعلہ خو آگے تو اتنا نہ جلاتا تھا مجھے
آج تو آگ ہوا غیروں کے بھڑکانے سے

بلا شبہ یہ اشعار بہت اچھے ہیں اور شاعری کی احسن روایات کے پاسدار ہیں۔ ان میں جو سلاست ہے، روانی ہے وہ قابل قدر ہے۔ لب ولہجہ بھی خوب ہے۔ محاوروں کے استعمال پر بھی شاعر کی قدرت کا اظہار بخوبی ہوا ہے۔ ڈاکٹر سید محمد حیدر لکھتے ہیں:۔

''شوق پر دوسروں کے اثرات پڑے ہوں، وہ ایک الگ بات ہے۔ لیکن ان کا کلام ان کی خاندانی روایات سے علیحدہ نہیں ہے۔ کم سے کم اس کا کچھ اندازہ آشفتہ اور شوق کے کلام کو سامنے رکھ کر ہو جاتا ہے۔'' (۱)

مرزا ابجود کے بارے میں قبل ذکر ہوا کہ وہ نواب شجاع الدولہ کی وفات کے بعد عراق چلے گئے۔ ''مقدمہ اثرستان'' کے مطابق وہاں انہیں قتل کر دیا گیا۔ جب ان کا انتقال ہوا اس وقت ان کے دو بیٹے صغیر سن تھے۔ بڑے کا نام مرزا علی خاں اور چھوٹے کا نام آغا علی خاں تھا۔ والد کے انتقال کے بعد یہ دونوں بیٹے عراق ہی میں مقیم رہے۔ تعلیم حاصل کی۔ اس کے بعد وارد ہندوستان ہوئے۔ نواب آصف الدولہ بے حد احترام سے پیش آئے اور حکیم مرزا علی خاں کو حکیم الملک کا خطاب دیا، بھائی کہہ کر باتیں کیں۔ یہ عزت واحترام نواب سعادت علی خاں اور غازی الدین حیدر کے وقت تک برقرار رہا۔ حکیم محمد کاظم

---

(۱) ''حیات شوق''، ڈاکٹر سید محمد حیدر، صفحہ ۳۶

کا بیان ہے:-

''حکیم مرزا علی خاں طبیب سلطانی کہ در عہد غازی الدین حیدر و شاہ نصیر الدین حیدر در ماہ یک ہزار روپیہ ملازم تھا۔ نہایت معزور و ممتاز مخاطب بخطاب طبیب الملک کے در علوم در سیہ و طبیہ نظیر و عدیل خود نداشتن در عہد محمد علی شاہ کہ حکیم مرزا علی خاں معتکف شدند۔''(۱)

حکیم مرزا علی خاں کے بیٹے حکیم مسیح الدولہ تھے۔ نام مرزا علی خاں تھا۔''مقدمہ اثرستان'' کی اطلاع کے مطابق وہ امجد علی شاہ اور واجد علی شاہ کے عہد میں شاہی طبیب تھے لیکن حکیم محمد کاظم کا بیان ہے کہ حکیم مسیح الدولہ عہد واجد علی شاہ میں اپنے والد کے انتقال کے بعد طبیب سلطانی بنے۔ وہ لکھتے ہیں:-

بعد انتقال حکیم صاحب موصوف (یعنی حکیم مرزا علی خاں) حکیم مرزا علی حسن خاں خلف حکیم مرزا علی خاں طبیب الملک در عہد سلطان واجد علی شاہ طبیب سلطانی شدہ مورد انواع عنایات و الطاف سلطانی گردیدہ، مخاطب بخطاب مسیح الدولہ بہادر شدند، در علوم طبیہ و در بہ نہایت تجر و کمال داشتند وعلماً وعملاً بہ جمیع المثال واقران خود فائز وخلف آنجناب حکیم مظفر حسین خاں کہ داروغہ دار الشفا پادشاہی بودند و نہایت ذی علم و عمل کہ گوئے سبقت از اہل زماں خود ربودند۔''(۲)

حکیم مسیح الدولہ اپنے وقت کے مشہور حکیم تھے۔ وہ شاہی طبیب کے علاوہ سفارت

---

(۱)''رسالہ سوانح عمری'' صفحہ ۱۶

(۲)''رسالہ سوانح عمری'' صفحہ ۱۴

کے منصب پر بھی فائز تھے۔ ''قیصر التواریخ'' کے مولف کمال الدین حیدر نے لکھا ہے:۔

''۱۲ر مارچ ۱۸۵۰ء روز شنبہ مطابق ۲۷ر ربیع الثانی کو خلعت سفارت محض تجویز خاص بادشاہ مسیح الدولہ حکیم مرزا علی خاں بہادر معالج خاص بادشاہ کو عنایت ہوا۔''(۱)

سفارت کے منصب پر فائز ہونے کی تصدیق ''تاریخ اودھ'' کے مصنف نجم الغنی نے بھی کی ہے۔ انہوں نے لکھا ہے کہ سلیمن کے بعد جب اوٹرم لکھنو آ رہے تھے تو مسیح الدولہ ۴ر دسمبر ۱۸۵۴ء کو ان کو لینے کانپور گئے تھے۔(۲)

حکیم مسیح الدولہ کے پاس نادر کتابوں پر مشتمل ایک عظیم کتب خانہ بھی تھا۔ جو ان کے بعد ان کے خلف مرزا مظفر حسین خاں کو ہاتھ لگا۔ غدر ۱۸۵۷ء میں اس کتب خانہ کو شدید نقصان پہنچا۔ جب نواب واجد علی شاہ ۱۸۵۶ء میں معزول ہو کر مٹیا برج گئے تو حکیم مسیح الدولہ بھی ان کے ساتھ وہاں منتخب ہوئے۔ اور ایک بار جو لکھنو چھوڑا تو پھر پلٹ کر کبھی وہاں نہ آئے۔ حتیٰ کہ اپنی بیٹی کی شادی میں بھی شرکت نہ کی جو لکھنو میں ہی ہوئی۔ ان کا کہنا تھا کہ یہ آنکھیں جس لکھنو کا عروج دیکھ چکی ہیں اس کا زوال نہیں دیکھ سکتیں۔ حکیم مسیح الدولہ کا انتقال ۱۸۶۲ء میں ہوا۔ وہ کلکتہ میں واقع امام باڑہ جلیل الدولہ میں دفن ہوئے۔ ان کا انتقال فالج سے ہوا۔ اگرچہ وہ فالج کے ماہر تصور کیے جاتے تھے۔(۳)

مرزا ابجو د کے دوسرے بیٹے اور حکیم مرزا علی خاں کے چھوٹے بیٹے حکیم آغا علی خاں

---

(۱)''قیصر التواریخ'' (جلد دوم)، کمال الدین حیدر، صفحہ ۷۵

(۲)''تاریخ اودھ'' (جلد پنجم)، نجم الغنی، صفحہ ۲۴۷

(۳)''حیات شوق''، ڈاکٹر سید محمد حیدر، صفحہ ۴۱

تھے۔ علم طب میں وہ بھی درک رکھتے تھے اور حکیم محمد کاظم کے بیان کے مطابق اپنے بڑے بھائی کی طرح وہ بھی شاہی ملازم تھے۔ "حیات شوق" کے مصنف کے مطابق حکیم آغا علی خاں کے دو بیویاں تھیں۔ پہلی بیوی سے دو بیٹے اور ایک بیٹی پیدا ہوئی۔ پہلے بیٹے کا نام حکیم تصدق حسین خاں عرف نواب مرزا شوق اور دوسرے کا نام آغا مرزا تھا۔ بیٹی کا نام مکہ بیگم تھا۔ آغا حسن نظم (مصنف مثنوی "لذت عشق") انہیں مکہ بیگم کے بطن سے تھے۔ دوسری بیوی سے کوئی اولاد تھی یا نہیں، اس کی اطلاع نہیں ملتی۔

**شادی اور اولاد** :- "حیات شوق" کے مصنف کی تحقیق کے مطابق نواب مرزا شوق نے دو شادیاں کیں۔ پہلی بیوی کا نام بسم اللہ بیگم تھا۔ دوسری شادی کے بارے میں ڈاکٹر سید محمد حیدر لکھتے ہیں:-

"بیوی کے انتقال کے بعد شوق کا ایک بیوہ عورت سے تعلق قائم ہوا (مصطفیٰ حسین صاحب نہیں بتا سکے کہ ان سے نکاح ہوا تھا یا متعہ یا کوئی اور صورت تھی) جن سے ایک لڑکا تھا۔ بقول مرزا مصطفیٰ وہ یہ لڑکا اپنے ساتھ لائی تھیں۔ اس لڑکے کا نام تھا سلطان مرزا۔ شوق کی زمینداری کے گاؤں سکروری میں محال سلطان مرزا اب تک موجود ہے۔ سلطان مرزا کے دو لڑکے منے صاحب اور منجھو صاحب اور دو لڑکیاں سیدہ بیگم اور راضیہ بیگم تھیں۔"(۱)

اولاد کے سلسلے میں عطاء اللہ پالوی صاحب کا بیان ہے کہ:-

"کسی نام کو زندہ رکھنے کے لئے حقیقتاً عیال کی نہیں صرف کمال کی ضرورت ہے۔ نسلی یادگار کوئی چیز نہیں، کسی کارنامہ کی حاجت ہے۔ جبھی تو ریاض نے شکر

---

(۱) "حیات شوق"، ڈاکٹر سید محمد حیدر، صفحہ ۴۱

ادا کیا تھا:

میرے اللہ نے بخشی مجھے اولاد سعید
میرے اشعار وہ ہیں جن سے مرا نام چلے

شوق کے اگر بیٹے اور پوتے ہوتے تو بھی شوق کا نام باقی نہ رہتا۔آج شوق کے دادا کو کون جانتا ہے؟ باپ سے کتنے واقف ہیں، مگر شوق نے اپنی معنوی اور وہ بھی ایک نہیں معتدد اولادیں ایسی چھوڑی ہیں، جن سے شوق کا نام جب تک اردو زبان زندہ ہے، نہ مٹ سکے گا۔اہل کمانوں کے نام ہمیشہ زندہ اور باقی رہے ہیں اور برابر زندہ اور پایندہ رہیں گے۔شوق کی بھی ایسی سعید اولادیں موجود ہیں جو ابد تا قیامت شوق کا نام قائم رکھیں گی۔"(۱)

عطا اللہ پالوی کے اس اقتباس سے یہ التباس ہوتا ہے کہ شوق کو کوئی اولاد نہ تھی۔وہ لاولد تھے۔ان کا نام باقی ہے تو صرف اولاد سعید یعنی ان کے شعری و تخلیقی کارناموں کی وجہ سے۔جہاں تک شوق کے نام کے زندہ اور پایندہ رہنے کا سوال ہے وہ یقیناً ان کی اولاد سعید کی وجہ سے ہے۔لیکن اس مسئلہ سے چشم پوشی بھی نہیں کی جاسکتی کہ شوق باپ بنے یا نہیں۔ڈاکٹر سید محمد حیدر نے مرزا مصطفےٰ حسین صاحب کے حوالے سے لکھا ہے کہ شوق کی دو بیٹیاں تھیں۔بڑی کا نام بادشاہ بیگم اور چھوٹی کا نام فاطمہ بیگم تھا۔اس بات کی تصدیق مکان کے رجسٹری سے متعلق کاغذات سے بھی ہوتی ہے جو سرور حسن صاحب کے پاس محفوظ ہیں۔(۲)

---

(۱)"تذکرۂ شوق"،عطا اللہ پالوی،صفحہ ۴۵

(۲)"تذکرۂ شوق"،عطا اللہ پالوی،صفحہ ۴۵

ڈاکٹر صاحب موصوف نے مزید تفصیل بتاتے ہوئے بیٹیوں کی شادی اور ان کی اولاد کا بھی ذکر کیا ہے۔ وہ رقم طراز ہیں:-

''بڑی بیٹی بادشاہ بیگم کی شادی مسیح الدولہ کے بھانجے حسن مرزا سے ہوئی تھی اور چھوٹی فاطمہ بیگم کی حکیم مرزا آغا حسن ازل سے ہوئی تھی۔ بادشاہ بیگم کے لڑکے کا نام حکیم مرزا مرتضی حسین تھا۔ حسین صاحب کی لڑکی کا نام وزیر بیگم عرف جھمن صاحبہ تھا۔ مرزا مصطفے حسین انہیں وزیر بیگم کے لڑکے ہیں۔ اب ضعیف العمر ہیں۔ انہیں سے راقم کی برابر ملاقاتیں جاری رہیں اور انہیں سے بہت سے خاندانی حالات معلوم ہوئے۔''(۱)

نواب مرزا شوق کی دوسری صاحبزادی فاطمہ بیگم کی لڑکی کا نام محمدی بیگم تھا۔ سید میر نثار علی کے لڑکے میر حسن سے منسوب ہوئیں۔ محمدی بیگم کے بطن سے دو لڑکے اور ایک لڑکی تھی۔ حکیم سید واجد حسین نظر، سید مہدی حسن احسن لکھنوی اور لڑکی کا نام بگن تھا۔ سید مہدی حسن احسن کے لڑکے صادق حسین طرار ہوئے۔

شوق کے خاندان کی ان تفصیلات سے دو تین امور خاص طور پر مترشح ہوتے ہیں۔ اول یہ کہ خاندان متمول تھا اور شرفائے لکھنو کے خاندانوں میں شمار ہوتا تھا۔ دوم یہ کہ اس خاندان کا تعلق بہ سلسلہ ملازمت شاہی دربار سے رہا۔ سوم یہ کہ طبابت و حکمت اس خاندان کا موروثی پیشہ تھا۔ چہارم یہ کہ اس خاندان نے صرف پیشہ طبابت تک ہی خود کو محدود نہ رکھا بلکہ شعر و ادب سے بھی دلچسپی لی اور پرورش لوح و قلم بھی کی۔ شوق نے بھی اپنی اس خاندانی روایت کو برقرار رکھا۔ وہ بھی حکیم تھے۔ طبابت ان کا پیشہ تھا۔ شعر و شاعری

---

(۱) ''حیات شوق''، ڈاکٹر سید محمد حیدر، صفحہ ۴۳

سے دلچسپی لی۔تمول انہیں بھی نصیب تھا۔شرفائے لکھنو کی طرح انہوں نے بھی زندگی گزاری۔شوق کے بعد بھی خاندان میں پرورش لوح وقلم کا سلسلہ جاری رہا۔اوپر کی تفصیلات میں شوق کے خاندان سے متعلق جن حضرات کے نام گنوائے گئے ہیں، ان میں تین نام تو بے حد نمایاں ہیں۔میری مراد آغا حسن نظم، حکیم مرزا آغا حسن ازل اور منشی سید مہدی حسن احسن لکھنوی سے ہے۔

آغا حسن نظم شوق کے بھانجے تھے۔ان کی مثنوی ''لذت عشق''مشہور ہوئی۔ اس کی شہرت کی ایک وجہ یہ بھی رہی کہ یہ مثنوی شوق کی مثنویوں کی ساتھ اشاعت پزیر ہونے کے سبب شوق سے منسوب کی جاتی رہی۔بعد میں محققوں نے وضاحت کی کہ یہ مثنوی شوق کی نہیں،نظم کی ہے۔

حکیم مرزا آغا حسن ازل لکھنوی شوق کے چھوٹے داماد تھے۔ان کی ایک مثنوی ''سحر عشق'' ہے۔اس کے سرورق پر یہ عبارت درج ہے:-

> ''مثنوی ''سحر عشق'' مصنفہ شاعر شیریں مقالی جناب حکیم مرزا آغا حسن صاحب ازل خویش جناب حکیم نواب مرزا صاحب۔''(۱)

ازل صبا کے شاگرد تھے۔کئی غزلیں اپنے استاد کے حکم سے آتش کو بھی دکھلائیں۔شاعری کے علاوہ طب سے بھی واقفیت تھی۔جوانی لکھنو میں گزری بعد ازاں تلاش معاش میں پٹنہ آئے اور یہیں سکونت اختیار کی۔ایک دیوان'' ضیائے تمنا عرف پروانہ آتش'' یادگار چھوڑی۔ایک مثنوی بطرز'' زہر عشق''،''سحر عشق'' لکھی۔۱۳۱۴ھ میں انتقال کیا۔حفیظ عظیم آبادی اور احسن ان کے تلامذہ میں سے تھے۔ان کی مثنوی کے اشعار سے

---

(۱)''مثنوی سحر عشق''۱۸۹۶ء،صفحہ۲

ان کے سنی العقیدہ ہونے کا پتہ چلتا ہے۔لیکن لالہ سری رام کا بیان ہے کہ:-

''اصلی امامیہ مذہب تھے۔مگر کسی وجہ سے قیام بہار کے زمانے میں تبدیل مذہب کر کے سنی ہو گئے تھے۔مگر مرض الموت میں مذہب امامیہ کا اعلان کر کے انتقال کیا۔''(۱)

منشی سید مہدی حسن احسن لکھنوی شوق کی نواسی کے لڑکے تھے۔اکثر لوگوں کو یہ مغالطہ ہوا ہے کہ منشی احسن، شوق کے نواسے تھے۔اس غلط فہمی کا سبب خود ان کا یہ بیان ہے:-

''ایک سے زائد مرتبہ مجھ سے یہ سوال کیا گیا ہے کہ میں ''زہر عشق'' کی شان نزول بتاؤں اور یہ اس لئے کہ حکیم نواب مرزا شوق میرے نانا تھے۔''(۲)

گیان چند جین، عشرت رحمانی اور رام بابو سکسینہ کو بھی یہ مغالطہ ہوا ہے۔لیکن اوپر کی تفصیل سے یہ بات واضح ہو چکی ہے کہ منشی احسن، شوق کے نواسے نہیں بلکہ نواسی کے بیٹے تھے۔وہ ۱۲۸۴ھ کے لگ بھگ پیدا ہوئے۔شاعر بھی تھے اور ڈرامہ نگار بھی۔شاعری میں پہلے آغا علی شمس اور پھر نفیس سے اصلاح لی۔انہوں نے ''زہر عشق'' کو ''دستاویز محبت'' کے نام سے ڈرامے کی شکل دی۔اس کے علاوہ انہوں نے کئی ڈرامے قلمبند کئے۔ بیشتر ڈرامے شیکسپیر کے ڈراموں پر مبنی ہیں۔مثلاً ''خون ناحق'' (ہیملٹ)''شہید وفا'' (اوتھیلو)''مرید شک'' (ونٹرس ٹیل)''دل فروش'' (مرچنٹ آف وینس)''گلنار و فیروزہ'' (رومیو اینڈ جولیٹ)''بھول بھلیاں'' (ٹویلتھ نائٹ) وغیرہ ازیں چند راولی بکاولی اور چندر پزوہ ان کے قابل ذکر ڈرامے ہیں۔انیس کے حالات زندگی پر مبنی ان کی

---

(۱)''خمخانہ جاوید'' (حصہ اول) لالہ سری رام، صفحہ ۲۸۵

(۲)''زہر عشق کیوں کر وجود میں آئی'' احسن لکھنوی، مشمولہ ''زہر عشق''

کتاب ''واقعات انیس'' مشہور ہے۔ ایک مثنوی ''جذب عشق'' لکھی۔ جس میں بقول ڈاکٹر گیان چند جین ''بہار عشق'' کی تقلید کی گئی ہے۔

**مکان :-** عطاءاللہ پالوی صاحب شوق کے مکان کے سلسلے میں لکھتے ہیں:-

''شوق کا مکان لکھنو کے جس حصہ میں تھا، اس وقت وہ پرانہ بزازہ کے نام سے مشہور ہے۔ یہ مکان شارع عام پر زنانہ اور مردانہ الگ الگ واقع تھا۔ آج کل اس سڑک کا نام وکٹوریہ اسٹریٹ ہے اور اس سے چند قدم کے فاصلے پر نخاس ہے یہ سڑک فی الحال دو میل سے زیادہ طویل ہے اور تال کٹورہ کی کربلا پر ختم ہوتی ہے۔''(۱)

منشی احسن لکھنوی نے بھی مذکورہ مکان کو موروثی قرار دیا ہے(۲) لیکن ڈاکٹر سید محمد حیدر نے اس مکان کے علاوہ شوق کے ایک اور مکان کا ذکر کیا ہے جو محلہ بنجاری ٹولہ میں واقع تھا۔ ان کا بیان ہے:-

''اس میں شبہ کی اب کوئی گنجائش نہیں ہے کہ شوق کا ایک قدیم مکان بنجاری ٹولہ یعنی کٹرہ ابوتراب خاں میں تھا اور وہ کم از کم ۱۸۶۲ء کے بندوبست تک اس مکان میں مقیم تھے۔ وکٹوریہ اسٹریٹ کا مکان انہوں نے بعد میں خریدا یا بنوایا ہوگا۔ ان کی اولاد میں کچھ لوگ کٹرہ کے مکان میں رہ گئے ہوں گے اور کچھ شوق کے ساتھ اس نئے مکان میں منتقل ہوگئے ہوں گے۔''(۳)

---

(۱) ''تذکرۂ شوق''، عطاء اللہ پالوی، صفحہ ۴۱

(۲) ''واقعات انیس''، منشی احسن لکھنوی، صفحہ ۵۹

(۳) ''حیات شوق'' ڈاکٹر سید محمد حیدر، صفحہ ۵۶

پرانا بزارہ یا وکٹوریہ اسٹریٹ والے مکان کی مزید تفصیل بتاتے ہوئے "حیات شوق" کے مصنف لکھتے ہیں۔

"پرانا بزارہ والا مکان سے میڈیکل کالج کی طرف جب رخ کیا جائے تو شیعہ کالج کے بالکل سامنے بائیں جانب واقع ہے۔ شوق آخر وقت تک اسی میں مقیم تھے۔ اس کے باہری حصہ میں ڈاکٹر سرور آغا صاحب کا دواخانہ ہے اور یہ افضل محل سے ملحق ہے۔ شوق کے بعد ان کی لڑکی فاطمہ بیگم نے اس کا کچھ حصہ اپنے داماد میر حسن علی کو ۱۰ر نومبر ۱۸۸۰ء کو دے دیا تھا اور کچھ حصہ ازل کے انتقال کے بعد ۱۰ر اپریل ۱۹۰۶ء کو کلکتہ کے محمد علی خاں عرف نواب بنے صاحب کے ہاتھ فروخت کر دیا تھا۔ یہ بات مجھے ان کاغذات سے معلوم ہوئی جو سرور حسن صاحب کے پاس محفوظ ہیں۔" (۱)

موصوف نے یہ اطلاع بھی بہم پہنچائی ہے کہ یہ مکان اب شوق کے خاندان کے کسی شخص کے پاس نہیں ہے۔ مکان کے اندر شوق کی بنوائی ہوئی ایک چھوٹی سی مسجد اور اس کے اندرونی حصہ میں ان کے ہاتھ کا بنوایا ہوا ایک امام باڑہ بھی ہے۔ ان مکانات کے علاوہ موضع سکروری میں بھی ان کا ایک مکان تھا۔ جہاں ان کی زمینداری تھی۔ لیکن شوق وہاں رہتے نہ تھے۔ ان کا قیام لکھنؤ میں ہی رہتا تھا۔ لکھنؤ میں بھی ایک مکان اور تھا جس میں ان کی دوسری بیوی رہا کرتی تھی۔ یہ مکان محلہ نواز گنج میں تھا۔ شوق وہاں آیا جایا کرتے تھے۔ لیکن ان کا مستقل قیام وہاں کبھی نہیں رہا۔ (۲)

---

(۱) "حیات شوق"، ڈاکٹر سید محمد حیدر، صفحہ ۵۶

(۲) "حیات شوق"، ڈاکٹر سید محمد حیدر، صفحہ ۵۶

**شکل و صورت اور لباس**:۔ ڈاکٹر سید محمد حیدر نے جناب باقر حسین صاحب رنگین کے حوالے سے لکھا ہے:۔

''قدیم زمانے میں دو ایسے شاعر تھے جن کی خوبصورتی کا عام طور پر چرچا ہوتا تھا ایک تھے جان صاحب اور دوسرے مرزا شوق۔''(۱)

شوق کی شکل وصورت اور لباس کے بارے میں عطا اللہ پالوی نے جو تفصیل بیان کی ہے اس سے بھی اس امر کی تصدیق ہوتی ہے، ساتھ ہی نواب مرزا شوق کے معیار و لباس کا اندازہ ہوتا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:۔

''شوق شکلاً بہت وجیہہ واقع ہوئے تھے۔ بھرے بھرے گال، ستواں ناک، بڑی بڑی آنکھیں، چوڑی پیشانی، سرخ وسپید رنگ، کشادہ سینہ، غرض اچھے خد وخال، بلند قامت اور بھرے جسم کے بزرگ تھے۔ جوانی میں شہر کے خوبصورت لوگوں میں ان کا شمار ہوتا تھا۔ پیرانہ سالی میں بھی آثار جمال موجود تھے۔ البتہ کمر کسی قدر جھک گئی تھی۔ گرمیوں میں سر پر چکن کی چوگوشیہ ٹوپی پہنتے تھے اور اس پر جالی کا رومال ہوتا تھا اور جاڑوں میں یہ ٹوپی شال کی ہوتی تھی جس پر روپہلی فیتوں کا کام ہوتا تھا۔ اور اس پر شالی رومال خواہ دوشالہ اوڑھتے تھے۔ پاؤں میں برابر زرد مخملی گھٹیلا جوتا ہوتا تھا۔ جب یہ مخملی جوتا کمیاب ہو گیا تو زرد مخمل کی زیر پائی پہننے لگے تھے۔ سفید نین سکھ اور زیادہ تر اودے گل بدن کا پاجامہ پہنتے تھے اور گرمیوں میں باریک ململ یا شربتی کا انگرکھا جس میں دردامن گوٹ لگی ہوتی تھی۔ کرتا پہننا اس زمانے میں معیوب تھا۔ بنیائن اس

---

(۱) ''حیات شوق''، ڈاکٹر سید محمد حیدر، صفحہ ۵۸

عہد تک رائج ہی نہ ہوئی تھی۔ کبھی کبھی خاص موقع پر نیم آستین شلوکہ جالی کے کپڑے کا چکن یا کسی سوتی کام کا انگوٹھے کے نیچے پہنتے تھے۔"(۱)

**عقیدہ اور مذہب** :- مرزا شوق مذہباً شیعہ تھے۔ یہ مذہب شاہان اودھ کا بھی تھا۔ شوق کی مذہبیت پر اس امر سے بھی روشنی پڑتی ہے کہ جہاں انھوں نے اپنے مکان میں ایک چھوٹی سی مسجد تعمیر کروائی وہیں انھوں نے ایک امام باڑہ بھی بنوایا۔ اس کا ذکر پرانا بزارہ والے مکان کی بحث کے دوران ہو چکا ہے۔ مثلاً "فریب عشق" کے یہ اشعار دیکھئے:-

| | |
|---|---|
| بعد احمد علی کے لکھ اوصاف | نہ رکے تیغ جس کی روز مصاف |
| آبرو دونوں نے برابر دی | تیغ حق تھے نبی نے دختر دی |
| دھوم اس تیغ کی ہے عرش تلک | ضرب حیدر سے کانپتے ہیں ملک |
| جب کیا فتح قلعہ خیبر | تھی یہی ذوالفقار زیب کمر |
| بھولی احمد کو پھر نہ یاد علی | آئی جس روز سے کہ ناد علی |
| ماسوا اس کے کیا یہ اوج ہے کم | دوش احمد پہ تھے علی کے قدم |
| مدح حیدر نہیں بشر کی مجال | اب سنو عشق جاں گداز کا حال |

"بہار عشق" کے یہ اشعار بھی ان کے مذہب پر دلالت کرتے ہیں:-

| | |
|---|---|
| ہے علی نے وہ مرتبہ پایا | کل اتی جس کی شان میں آیا |
| کیا بشر پھر کرے ثنائے علی | مدح جب خود کرے خدائے علی |
| خاتم الانبیا کا نائب ہے | بخدا مظہر العجائب ہے |

---

(۱) "تذکرہ شوق"، عطا اللہ پالوی، صفحہ ۴۰

بعد حیدر کے اور ہیں جو امام — بخدا نور کبریا ہیں تمام
کوئی ان میں نہیں علی سے جدا — تا بہ مہدی ہیں سب امام ہدا

''زہر عشق'' کے یہ دو اشعار:

مدح حیدر میں کھولئے جو دہن — اس سے آگے نہیں ہے جائے سخن
کون حیدر کا مرتبہ سمجھا — کوئی بندہ کوئی خدا سمجھا

**تعلیم اور استعداد علمی:** —مرزا شوق کی تعلیم رواج زمانہ کے مطابق ہوئی تھی۔ ابتدائی تعلیم گھر پر ملی۔ علم طب و حکمت ان کا موروثی علم تھا۔ لہذا اسے حاصل کیا۔ دوسرے علوم سے بھی وہ بے بہرہ نہ تھے۔ ڈاکٹر شاہ عبدالسلام لکھتے ہیں:-

> ''ابتدائی تعلیم گھر ہی پر مکمل کی۔ اس کے بعد اپنے عہد کے مشہور و معروف اساتذہ کی تعلیم اور فیضان صحبت سے مختلف علوم میں مہارت حاصل کی۔ علم طب اور حکمت پر بھی پورا پورا عبور حاصل کیا۔'' (۱)

شاہ عبدالسلام صاحب نے شوق کی تعلیم کے سلسلے میں مشہور و معروف اساتذہ کی جانب صرف اجمالی طور پر ذکر کیا ہے۔ نام نہیں بتایا کہ وہ کون مشہور اساتذہ تھے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ انہوں نے قیاساً یہ بات رقم کر دی۔ ورنہ سچ تو یہ ہے کہ ان کا خیال عطا اللہ پالوی صاحب کے اس اقتباس سے ہی ماخوذ ہے:-

> ''شوق نے ابتداً گھر پر تعلیم حاصل کی۔ اس کے بعد اپنے شوق سے تمام علوم متداولہ حاصل کئے تھے۔ یہاں تک کہ حکمت بھی پڑھی تھی اور دیگر مروجہ فنون مختلفہ میں بھی ان کا ذوق بہت اچھا تھا۔ ایسا اگر نہ بھی ہوتا تو مضائقہ نہ تھا۔

---

(۱) ''کلیات شوق''، صفحہ ۱۱

اس لئے کہ فی نفسہ ایک شاعر کے لئے صاحب علم وفضل ہونا لازمی نہیں ہے۔
شعر گوئی ایک وہبی چیز اور عطیہ قدرت ہے جو کسی علمی سند کی محتاج نہیں۔"(۱)

طب اور حکمت خاندانی علم تھا۔ اس لئے شوق اس فن سے بے بہرہ تو ہرگز نہ تھے۔ گو وہ اس فن میں اس مرتبہ کو نہ پہنچ سکے جہاں تک ان کے چچا مرزا علی خاں اور چچا زاد بھائی حکیم مسیح الدولہ کی رسائی تھی۔ تاہم وہ اس میں اس حد تک ضرور استعداد رکھتے تھے کہ اپنا مطب چلا سکیں اور مریضوں کا علاج کر سکیں۔ آغا حجو شرف کے اس بیان میں مبالغہ سہی لیکن اسے بے بنیاد ہرگز نہیں قرار دیا جا سکتا:

سمجھتے ہیں عیسیٰ جو بیمار ہیں  اس طرح سے تجربہ کار ہیں
قضا کی جو عبرت سے رہتے ہیں ست  مریض ایسے ایسے کئے تندرست

مرزا شوق کی علمی استعداد کی بہترین مظہر ان کی مثنویاں، واسوخت اور غزلیں ہیں۔ ان کے مطالعہ سے یہ رمز آشکارا ہوتا ہے کہ شوق کو دنیات کے مبادیات پر گہری نظر تھی۔ زبان پر عبور حاصل تھا۔ عربی اور فارسی زبان پر بھی اچھی دستگاہ تھی۔ پھر وہ اپنے عہد کے مروجہ محاورات سے بھرپور واقفیت رکھتے تھے۔ ان کی نگاہ عہد متعلقہ کی لسانی تحریک کے تمام پہلوؤں پر بھی تھی۔ راقمہ نے جو اشعار پچھلے صفحات پر حضرت علی کی مدح میں نقل کئے ہیں انہیں اپنے موقف کی تائید میں پیش کیا جا سکتا ہے۔ ذیل کے چند اشعار سے ان کی عربی اور فارسی دانی نیز دیگر علوم سے واقفیت پر روشنی پڑتی ہے:-

بابا آدم نے ہے اسی سے شرف  تاج فرق پیمبران سلف
سچ کہ محبوب کبریا ہے وہ  خلق میں نائب خدا ہے وہ

"فریب عشق" (نعت)

---

(۱) "تذکرۂ شوق"، عطاء اللہ پالوی، صفحہ ۴۲

کس زباں سے کروں صفات خدا
کیا بشر سمجھے کیا ہے ذات خدا

جب نبی یوں کہے کہ اے مالک
ما عرفناک حق معرفتک

''بہارِ عشق'' (حمد باری)

نعت احمد لکھے گا کیا مداح
خلق کا جس کے ہو خدا مداح

''بہارِ عشق'' (نعت رسول)

ہے علی نے وہ مرتبہ پایا
کل اتی جس کی شان میں آیا

''بہارِ عشق'' (منقبت جناب امیر)

ذات احمد کو کوئی کیا جانے
یا علی جانے یا خدا جانے

''زہرِ عشق'' (نعت)

لکھ قلم پہلے حمد رب ودود
کہ ہر اک جا پہ ہے وہی موجود

ذات معبود جاودانی ہے
باقی جو کچھ کہ ہے کہانی ہے

ہم سر اس کا نہیں ندیم نہیں
سب ہیں حادث کوئی قدیم نہیں

''زہرِ عشق'' (حمد)

صبح کو طائران خوش الحان
پڑھتے ہیں کل من علیہا فان

موت سے کس کو رستگاری ہے
آج وہ کل ہماری باری ہے

''زہرِ عشق''

**اخلاق و عادات :** — منشی احسن لکھنوی نے شوق کے بارے میں اپنے ایک مقالہ میں لکھا ہے:—

''نواب مرزا بہت خوش باش، عیش پسند اور رنگین مزاج تھے۔ اس لئے حکیم مسیح الدولہ بہادر نے انہیں دربار سے ہمیشہ علیحدہ رکھا اور محلات کا علاج کبھی ان

سے متعلق نہ کیا۔" (۱)

عطااللہ پالوی نے "تذکرہ شوق" میں لکھا ہے:-

"فریب عشق سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت شوق عشق و محبت کے اثرات سے مستغنی تھے اور صرف عورت کی تلاش میں ساتھیوں کے ساتھ کربلا اور درگاہ مارے مارے پھرتے تھے۔" (۲)

مولانا عبدالماجد دریابادی رقم طراز ہیں:-

"غرض نواب مرزا کو اپنی پست مذاقی اور مبتذل نگاری کی سزا مشرق کی عدالت گاہ سے ملی اور بجا طور پر ملی، لیکن وہ خود بھی آخر شرقی ہی تھا۔ باوجود انگھاتی بے حیائی کے یہ ناممکن ہوا کہ، چوری کے جرم پر، سینہ زوری، کا بھی اضافہ کرے .......... عمل میں کیسی بھی شرمناک کمزوریاں اور کوتاہیاں ہوں لیکن ایمان میں فحش و بے حیائی کا جواز داخل نہ تھا..........." (۳)

اوپر تین اقتباسات نقل کئے گئے۔ پہلا اقتباس منشی احسن لکھنوی کا ہے، جو خیر سے شوق کے ہی خاندان سے تعلق رکھتے ہیں، ان کے مطابق مرزا شوق خوش باش تھے، عیش پسند اور رنگین مزاج تھے۔ اور اس حد تک رنگین مزاج کہ ان کے بڑے چچازاد بھائی کو ان کے کردار پر بھی اعتماد نہ تھا۔ یہی سبب ہے کہ انہوں نے شوق کو محلات کے علاج سے ہمیشہ دور رکھا۔ پتہ نہیں احسن لکھنوی نے یہ باتیں شوق کی تعریف میں لکھی ہیں یا تنقیص میں۔

---

(۱) "زہر عشق کیوں کر وجود میں آئی"، منشی احسن لکھنوی، مجنوں ایڈیشن، صفحہ ۴۳

(۲) "تذکرۂ شوق"، عطااللہ پالوی، صفحہ ۹۹

(۳) "اردو کا ایک بدنام شاعر"، مشمولہ "کلیات شوق" صفحہ ۴۳-۴۴

بعد کے محققوں نے احسن لکھنوی کے اس بیان کو بے سروپا قرار دیا ہے۔

دوسرا بیان عطا اللہ پالوی صاحب کا ہے۔ ان کے بیان سے مترشح ہوتا ہے کہ مرزا شوق لکھنوی کے کردار میں بے فکری، آوارہ گردی، اور شہدہ پن کے عناصر بدرجہ اتم موجود تھے۔ گھر میں کوئی کام نہ تھا اور نہ ہی انہیں اپنی خاندانی شرافت ونجابت کا پاس تھا۔ وہ دن بھر کربلا اور درگاہ حسین عورتوں کے پیچھے مارے مارے پھرتے تھے۔ حیرت ہے کہ عطا اللہ پالوی نے یہ بات کس ترنگ میں لکھی ہے، حالانکہ ''تذکرہ شوق'' میں انہوں نے جابجا شوق لکھنوی کو مصلح معاشرت اور اپنے عہد کا ہیرو بنا کر پیش کرنے کی سعی کی ہے۔ دراصل پالوی صاحب نے شوق کے بارے میں یہ قیاس ان کی مثنوی کی بنیاد پر کی ہے۔ چونکہ وہ ان کی مثنویوں کو آپ بیتی مانتے ہیں اور نواب مرزا شوق کو ان مثنویوں کا ہیرو تصور کرتے ہیں، لہذا وہ شوق کی تصویر انہیں مثنویوں کے آئینے میں دیکھتے ہیں۔ اگر شوق کے اخلاق وعادات کا تعین ان مثنویوں کی بنیاد پر کیا جائے تو پھر شوق اور ایک شیطان میں کم ہی فرق نظر آئے گا۔

تیسرا اقتباس عبدالماجد دریابادی کا ہے۔ اس اقتباس میں شوق کو پست مذاق، فحش گو، مبتذل نگار اور بے حیا قرار دیا گیا ہے۔ ان کے عمل میں شرمناک کمزوریاں اور کوتاہیاں تھیں۔ البتہ وہ مشرقی تھے، ایمان رکھتے تھے، مسلمان تھے وغیرہ وغیرہ۔ ظاہر ہے عبدالماجد دریابادی نے شوق کے کردار و اخلاق کے بارے میں جو کچھ فرمایا ہے، اس کی بنیاد بھی یہی مثنویاں ہیں۔ مجنوں گورکھپوری نے شوق کی جذبات نگاری کی تعریف کرتے ہوئے ایک جگہ لکھا ہے:-

''حیرت اس بات پر ہے کہ جو شخص صرف اپنی اوباشیوں کے کارنامے قلمبند کرتا آیا ہو وہ انسان کے صحیح جذبات کو ایسے عام فہم اور دلنشیں انداز میں بیان

کرنے کی قدرت کہاں سے لایا۔''(۱)

اس اقتباس سے بھی یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ شوق اوباش قسم کے انسان تھے۔ البتہ جذبات نگاری پر ان کی گرفت مضبوط تھی۔ لیکن اوباشی کا یہ الزام بھی ان کے تخلیقی کارناموں کی بنا پر لگایا جا رہا ہے۔ حالانکہ کسی شخص کی شخصیت، کردار، اخلاق و عادات کی تفہیم و تعین میں اس کی تخلیق کس حد تک معاون ہوتی ہے، یہ ایک طولانی اور پیچیدہ بحث ہے۔ اس کی تائید اور تردید میں لاتعداد صفحے رنگین کئے گئے ہیں۔ نفسیاتی بھول بھلیوں، شعور، لاشعور اور تحت الشعور کی تہوں میں اترنے پر اور الفاظ کے پوست کو اتارنے پر شاید فنکار کا چہرہ نظر آئے، وہ بھی صاف نہیں بلکہ مبہم اور ناصاف ہوگا۔ کسی فنکار یا شاعر کے برہنہ بیان کو اس کی شخصیت اور کردار کے لئے میزان بنانا میری ناقص رائے میں درست نہیں۔ اگر ایسا ہوا تو ہمارے ثقہ اور کٹر مذہبی قسم کے شاعروں کا دامن داغدار نظر آئے گا۔ اور بہت سے آوارہ مزاج اور بے راہ رو شاعروں اور فنکاروں کی جگہ صوفیائے باصفا کی صف میں محفوظ ہو جائے گی۔

شوق کے اخلاق و عادات کے بارے میں سچ تو یہ ہے کہ ٹھوس اطلاعات بہت کم ہیں۔ جتنی باتیں ہیں قیاسی ہیں اور جب شوق کے متعلق ظن ہی رکھنا ہو، تو حسن ظن کیوں نہ رکھا جائے۔

شوق کے خاندانی حالات پچھلے اوراق میں پیش کئے گئے ہیں۔ اس سے یہ قیاس بجا طور پر کیا جا سکتا ہے کہ وہ ایک متمول اور معزز خاندان کے چشم و چراغ تھے۔ شریف خاندان کے شریف بیٹے تھے۔ اوباش اور آوارہ گرد نہیں تھے۔ ہم نے یہ بھی دیکھا کہ شوق

---

(۱) ''مرزا شوق اور مثنوی زہر عشق''، مجنوں گورکھپوری، مشمولہ کلیات شوق، صفحہ ۶۷

ذی علم آدمی تھے۔ طب، حکمت، زبان، عروض، بلاغت اور دنیات پر ان کی گہری نگاہ تھی۔ کیا کسی ایسے ذی علم شخص سے اوباش کی توقع کرنا درست اور مناسب ہے۔ شوق کے بارے میں یہ بھی معلوم ہے کہ وہ طبابت کا پیشہ بھی کرتے تھے اور باقاعدہ اپنا مطب چلاتے تھے۔ اس لئے نہیں کہ دولت کمائیں بلکہ اس لئے کہ خدمت خلق کریں۔ اپنے علم اور تجربہ سے عوام کو فائدہ پہنچائیں۔ یہی سبب ہے کہ بیمار انہیں عیسیٰ نفس مانتے تھے۔ اس سے یہ رمز ملتا ہے کہ شوق انسان دوست اور خلق اللہ کے خیر خواہ تھے، ہمدرد اور غم گسار تھے۔ ہمدردی اپنے ساتھ اور بھی کئی نیک انسانی خصلتوں کو کھینچ لاتی ہے۔ مثلاً خوش اخلاقی، ملن ساری، انکساری اور عاجزی وغیرہ۔ شوق میں بھی یہ صفتیں موجود تھیں۔ وہ تندرست تھے، خوش باش تھے، خوش رو اور خوش خصال تھے۔ ان کی منکسر المزاجی پر روشنی احسن لکھنوی کے اس بیان سے بھی پڑتی ہے:-

"وہ (شوق) اپنے احباب میں جب کبھی شاعری کا ذکر کرتے تھے تو کھلے الفاظ میں اسکا اعتراف کرتے تھے کہ مجھے فن شعر گوئی سے کوئی لگاؤ نہیں ہے۔" (۱)

شوق واقعی شاعر نہ تھے، ایسی بات نہیں۔ فن شعر گوئی سے انہیں گہرا لگاؤ تھا۔ کم از کم ان کی مثنویاں اس حقیقت پر دلالت کرتی ہیں۔ دراصل ان کا یہ فرمانا کہ "مجھے فن شعر گوئی سے کوئی لگاؤ نہیں" ان کی منکسر المزاجی پر دال ہے۔ شوق شاعر تھے، اور ایک شاعر عام انسانوں کے مقابلہ میں زیادہ حساس اور ملتہب دل کا مالک ہوتا ہے۔ شوق میں بھی یہ خوبیاں لازمی طور پر موجود تھیں۔

شوق کے بارے میں یہ کہا جاتا ہے کہ وہ یار باش آدمی تھے۔ لکھنؤ کی اکثر محفلوں

---

(۱) بحوالہ "مثنویات شوق" مرتبہ: عطاء اللہ پالوی، حرف اول، صفحہ ۶۱

میں وہ شریک ہوتے تھے لہذا آداب محفل سے وہ بخوبی واقف تھے۔ساتھ ہی بذلہ سنج، خوش مذاق اور ظریف بھی واقع ہوئے تھے۔علمی مجلس میں طاق اور لطیفہ گوئی میں مشاق تھے۔یہی وجہ ہے کہ شوق کا شمار متوسط طبقے کے صف اول میں ہوتا تھا۔وہ ارکان شہر میں گنے جاتے تھے۔لکھنو کی اعلی سوسائٹی کے ممبر تھے۔شرفا کی مجلس میں وہ ضرور ہی موجود ہوتے تھے۔عطا اللہ پالوی نے لکھا ہے:-

''لکھنو کا یہ زریں دور تھا۔لہذا شوق کے معاصرین میں اور بھی شعرا تھے اور شوق کی ان سب سے ملاقات تھی، بلکہ سب سے دوستانہ مراسم تھے۔چنانچہ اس زمانہ میں منشی مظفر علی اسیر کے یہاں ہر جمعہ کو شعرا کا مجمع ہوا کرتا تھا۔جس میں شاعری، علم عروض، اور زبان کی درستی کے متعلق ردوقدح ہوا کرتی تھی اور شعروشاعری کا چرچہ ہوا کرتا تھا۔اس بزم میں شوق بھی ضرور شریک ہوا کرتے تھے۔''(۱)

**ذریعہ معاش** :-شوق کا بیان ہے کہ:

زر خدا نے دیا تھا کثرت سے　　　مال دنیا ملا تھا حکمت سے
خوش گزرتے تھے اسطرح ایام　　　عیش رہتا تھا صبح سے تا شام
(''فریب عشق'')

عطا اللہ پالوی رقم طراز ہیں:-

''باپ دادا کی حکمت اور خاندان کی شاہی ملازمت سے حاصل کی ہوئی کافی دولت گھر میں موجود تھی لہذا فکر معاش سے آزاد تھے۔اور اس لئے انہوں نے

---

(۱)''تذکرۂ شوق''،عطاء اللہ پالوی،صفحہ۵۵

کبھی ملازمت کی اور نہ کوئی پیشہ اختیار کیا"(۱)

صاف ظاہر ہے کہ عطا اللہ پالوی نے "فریب عشق" سے خوشہ چینی کی ہے اور ان اشعار کی بنیاد پر نتیجے اخذ کیے ہیں۔

شوق زمیندار تھے۔ موضع سکروری میں ان کی زمینداری تھی۔ "حیات شوق" کے مصنف نے بتایا ہے کہ شوق نے جس سے گاؤں خریدا تھا، وہ دخل قبضہ نہ دے رہے تھے۔ چنانچہ ایک خان صاحب جن کا نام عبدالباسط تھا اور جو شوق سے بڑی محبت کرتے تھے، کے زور اور اثر سے گاؤں پر قبضہ کیا جا سکا اور اس کے صلہ میں شوق نے آدھا گاؤں عبدالباسط کو دے دیا۔ پھر شوق نے اپنے حصے کی زمین کو دو حصوں میں بانٹ کر ایک حصہ اپنی بڑی بیٹی بادشاہ بیگم کے لڑکے حکیم مرزا مرتضیٰ کو دیا تھا جن کی پرورش شوق نے کی تھی، دوسرا حصہ سلطان مرزا کے نام لکھ دیا تھا جو ان کے بیٹے قرار دیے گئے۔ یہ شوق کا قدیم گاؤں تھا لیکن شوق وہاں رہتے نہ تھے۔

موروثی دولت اور زمینداری کے علاوہ شوق کا پیشہ طبابت تھا۔ ڈاکٹر سید محمد حیدر نے مہذب صاحب کے حوالے سے یہ اطلاع بہم پہنچائی ہے کہ ان کا پیشہ طبابت تھا اور ان کا مطب توپ دروازہ میں تھا۔ لیکن انہوں نے اس کو ذریعہ معاش نہیں بنایا۔ ذریعہ معاش کے ضمن میں ایک بیان احسن صاحب کا بھی ہے۔ وہ اپنے مقالے میں لکھتے ہیں:۔

"حکیم مسیح الدولہ بہادر نواب مرزا صاحب سے عمر میں بڑے تھے اور اپنے چھوٹے چچازاد بھائی (شوق) سے بہت محبت کرتے تھے۔ چونکہ حکیم نواب مرزا بہت خوش باش، عیش پسند اور رنگین مزاج تھے۔ اس لئے حکیم مسیح الدولہ

---

(۱) "تذکرۂ شوق"، عطاء اللہ پالوی، صفحہ ۴۳

بہادر نے انہیں دربار سے ہمیشہ علیحدہ رکھا اور محلات کا علاج کبھی ان سے متعلق نہ کیا۔ لیکن جب اودھ کے آخری تاجدار واجد علی شاہ کا زمانہ آیا تو نواب مرزا کی رسائی دربار میں پورے طور پر ہوگئی۔ نواب واجد علی شاہ ان کو بہت عزیز رکھتے تھے۔ پانچ سو روپیہ ماہوار ان کا مشاہرہ مقرر تھا اور انعام و اکرام کی کوئی حد نہ تھی۔ حکیم نواب مرزا صاحب ایک ذی علم شخص تھے، طبیب حاذق تھے اور فنون میں ان کا ذوق بہت اچھا تھا۔" (۱)

اس اقتباس سے ایک پہلو یہ سامنے آیا کہ نواب مرزا شوق، نواب واجد علی شاہ کے شاہی ملازم تھے اور انعام و اکرام کے علاوہ پانچ سو روپے ماہوار تنخواہ بھی پاتے تھے۔ پانچ سو روپے اس زمانہ کے لئے بہت تھا۔ لیکن یہ بات کس حد تک درست ہے؟ کیا منشی احسن لکھنوی کے اس بیان کو تسلیم کرلیا جائے اس لئے کہ وہ شوق کی نواسی کے بیٹے تھے؟ منشی احسن کے بیان سے محققوں کے مابین ایک بحث یہ چل پڑی ہے کہ آیا شوق کا تعلق دربار واجد علی شاہ سے تھا یا نہیں۔ اس ضمن میں منشی احسن لکھنوی کا ایک اور بیان ہے۔ "واقعات انیس" میں وہ لکھتے ہیں:-

"ہم اپنے ناظرین کو تھوڑی دیر کے لئے ۱۸۵۳ء کا لکھنو دکھاتے ہیں اور اس دربار شاہی میں پہنچائے دیتے ہیں جہاں جناب شوق بادشاہ اودھ کے تخت کا پایہ تھامے ہوئے جھوم جھوم کر اپنی مثنوی پڑھ رہے ہیں اور اردوئے معلیٰ کی جادو بھری نظم نے اہل دربار کو بے خود و مست بنادیا ہے۔" (۲)

---

(۱) "مثنوی زہر عشق کیوں کر وجود میں آئی"، منشی احسن لکھنوی، مشمولہ "زہر عشق"، صفحہ ۴۴

(۲) "واقعات انیس"، منشی احسن لکھنوی، صفحہ ۳۷

اگرچہ یہاں موصوف نے یہ دعویٰ تو نہیں کیا ہے کہ واجد علی شاہ کے دربار میں شوق ملازم تھے لیکن یہ تاثر دینے کی سعی البتہ کی ہے کہ ان کا دربار میں آنا جانا تھا۔ وہاں وہ اپنی مثنویوں کو پڑھ کر سناتے تھے اور بادشاہ کے ساتھ اہل دربار ان کی صفائی زبان پر بے خود و مست ہو جایا کرتے تھے۔ بہرکیف، عطا اللہ پالوی نے منشی احسن لکھنوی کے اس بیان پر سخت نکتہ چینی کی ہے کہ شوق نواب واجد علی شاہ کے دربار سے وابستہ تھے اور انہیں پانچ سو روپے تنخواہ ملتی تھی۔ عطا اللہ پالوی صاحب کے دلائل دیکھئے:۔

(۱): —— کسی واقعہ، تصنیف یا روایت سے اس کی شہادت نہیں ملتی۔

(۲): —— اس عہد کے کسی دیسی دربار میں پانچ سو روپے کسی شاعر کا مشاہرہ نہ تھا۔ سرور کو ۱۸۴۷ء میں تخت نشینی کے بعد واجد علی شاہ نے درباری شاعر مقرر کیا تو ان کی تنخواہ ۵۰ر روپے ماہانہ مقرر کی۔

(۳): —— خود احسن صاحب نے اپنے بیان کی تردید کردی ہے، وہ لکھتے ہیں:۔

"چونکہ حکیم نواب مرزا صاحب بہت خوش باش، عیش مزاج تھے اس لئے حکیم مسیح الدولہ بہادر نے انہیں دربار سے ہمیشہ علیحدہ رکھا۔"(۱)

چنانچہ جب وہ علیحدہ رہے تو تنخواہ کس بات کی؟

(۴): —— دل تمنائے وصل رو دارد • چہ بلا مشکل آرزو دارد

"بہار عشق" کا یہ شعر شاہد ہے کہ ان کی رسائی دربار تک نہ تھی۔

(۵): —— اور دوسری مثنویوں میں واجد علی شاہ کی تعریف و مدح کے اشعار موجود ہیں۔ لیکن ان کے شاعر دربار سے وابستہ نہ تھے۔

---

(۱) "تذکرۂ شوق"، عطا اللہ پالوی، صفحہ ۴۳

ان دلائل کی روشنی میں عطا اللہ پالوی اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ حکیم احسن صاحب لکھنوی کا یہ فرمانا کہ شوق واجد علی شاہ کے دربار میں نوکر تھے۔ان کا مشاہرہ پانچ سو روپے تھا اور انعام و اکرام کی حد نہ تھی، پایہ اعتبار سے ساقط ہے۔

''زہر عشق'' کی شان نزول کے ضمن میں ڈاکٹر گیان چند جین نے اپنی کتاب ''اردو مثنوی: شمالی ہند میں'' کے ص ۵۱۷ کے نوٹ میں لکھا ہے:-

''چند سال ہوئے پروفیسر مسعود حسن رضوی نے اس سلسلہ میں مجھ سے گفتگو کی۔موصوف احسن مرحوم کو بخوبی جانتے تھے۔آپ کی رائے میں احسن معتبر راوی نہ تھے۔''(۱)

''حیات شوق'' کے مصنف نے قاضی عبدالودود صاحب کا ایک اقتباس نقل کیا ہے۔یہ اقتباس جادۂ تحقیق پر چلنے والوں کے لئے ایک رہنما اصول ہے۔وہ لکھتے ہیں:-

''کہا جاتا ہے کہ گھر والے گھر کا حال بہتر جانتے ہیں۔مگر کچھ ضروری نہیں کہ وہ اپنے یا اپنے بزرگوں کے متعلق جو کچھ لکھیں وہ صحیح ہو۔غالب اپنے کو ترک ایبک کہتے ہیں۔لیکن ایبک ترکوں کی کوئی قسم ہی نہیں۔شاد عظیم آبادی نے اپنا نسب حسین فیروزی شاہ شیراز معاصر حافظ سے ملایا ہے۔ اس نام کا کوئی بادشاہ نہیں گزرا۔''(۲)

بہر کیف، اب میں پھر رجوع کرتی ہوں شوق کی دربار واجد علی شاہ سے وابستگی اوران کی تنخواہ سے۔عطا اللہ پالوی نے اسے بے بنیاد قرار دیا۔لیکن'' کلیات شوق'' کے

---

(۱)''اردو مثنوی: شمالی ہند میں''، ڈاکٹر گیان چند جین، صفحہ ۵۱۷

(۲) بحوالہ ''حیات شوق'' ڈاکٹر سید محمد حیدر، صفحہ ۴۷

مرتب ڈاکٹر شاہ عبدالسلام نے پالوی صاحب سے اتفاق نہیں کیا ہے:۔

''راقم کو پالوی صاحب کی رائے سے اتفاق نہیں ہے۔اگرچہ اس دور میں پانچ سو روپیہ کا مشاہرہ بڑی بات تھی اور اتنی بڑی تنخواہ یا مشاہرہ خود ناسخ یا بادشاہ کے استاد محمد رضا برق کے حصے میں بھی نہ آئی۔لیکن ہوسکتا ہے کہ شوق چونکہ شاہی معالج تھے اور پھر ان کی ادبی خدمات سے خوش ہوکر بادشاہ نے ان کی یہ غیر معمولی تنخواہ مقرر کی ہو۔پالوی صاحب کو اس بات سے بھی انکار ہے کہ شوق کو دربار میں رسائی حاصل تھی اور شوق نے آبائی پیشہ اختیار کیا تھا، حالانکہ یہ دونوں باتیں صحیح ہیں۔شوق کو بادشاہ وقت کے دربار میں نہ صرف خاص مقام حاصل تھا بلکہ شوق شاہی معالج بھی تھے اور شوق نے اپنا آبائی پیشہ طبابت بھی اختیار کیا تھا'' (۱)

شاہ صاحب موصوف کے نزدیک شوق کی دو حیثیتیں ہیں، پہلی حیثیت شاعر کی ہے اور دوسری طبیب کی۔شوق شاہی دربار سے ان دونوں حیثیتوں سے وابستہ تھے۔ دراصل شاہ صاحب کی نگاہ آغا حجو شرف صاحب کے ان اشعار پر گئی ہے، جن میں انہوں نے شوق کا تعارف کرایا ہے اور اسی بنا پر وہ عطا اللہ پالوی کی دلیل کی تردید کر بیٹھتے ہیں۔ بہرکیف، پہلے آغا حجو شرف کے یہ اشعار دیکھئے:

سر افراز نواب مرزا حکیم — معالج یہ ہیں بادشاہی قدیم
حقیقت میں عیسیٰ ثانی یہ ہیں — بڑے نامور خاندانی یہ ہیں
علاجوں کا عالم میں افسانہ ہے — مطب ان کا جو ہے شفا خانہ ہے

---

(۱) ''کلیات شوق''، صفحہ ۱۳

سمجھتے ہیں عیسیٰ جو بیمار ہیں　　اسی طرح کے تجربہ کار ہیں
یہ عہد خلافت میں کامی رہے　　ہمیشہ عمائد میں نامی رہے
یہ شاگرد آتش کے ہیں نامور　　ظریف و جہاں آشنا، خوش سیر
قضا کی جو جرأت سے بچتے ہیں ست　　مریض ایسے ایسے کئے تندرست (۱)

ڈاکٹر سید محمد حیدر نے آغا حجو شرف کے بارے میں لکھا ہے کہ ان کی تعریف کا ڈھنگ کچھ عجیب سا ہے۔ وہ ایک ہی طرح کے جملے بار بار ہر خاص و عام کے لئے استعمال کرتے ہیں۔ ایک ایسے شاعر کی تعریف جو غیر معروف ہیں، یعنی افضل کی تعریف اس طرح کرتے ہیں:

یہ ہیں جو حسن یار خاں بار یاب　　کہ ہے اسد الدان کا خطاب
مدرس عمودی و کامی یہ ہیں　　بڑے شاعروں میں ہی نامی یہ ہیں

ایک اور حکیم صاحب کی تعریف کا انداز دیکھئے:

علی میرزا جو یہاں ہیں حکیم　　معزز یہ ہیں خاندانی حکیم
مطب میں مریضوں کی شنوائی ہے　　جو تشخیص ہے، وہ مسیحائی ہے

حسن صاحب اور ان کی ہمنوائی میں شاہ عبدالسلام صاحب نے اور آغا حجو شرف نے شوق کو شاہی معالج بتایا ہے۔ ساتھ ہی شوق کی شاعرانہ حیثیت سے وابستگی پر بھی روشنی ڈالی ہے۔ ڈاکٹر سید محمد حیدر کی تحقیق ہے کہ شوق شاہی طبیبوں کی فہرست میں نظر آتے ہیں اور دربار سے وابستہ شعرا کی صف میں۔ گارساں دتاسی نے اپنے خطبات میں نواب واجد علی شاہ کے دربار سے وابستہ چار سو شعرا کا ذکر کیا ہے۔ "تحفۂ نو جویہ" کے مؤلف نے

(۱) [illegible] کلیات شوق [illegible]

خاص خاص شعرا کی فہرست درج کی ہے۔ان کے مطابق خواجہ اسد قلق، ذکی، درخشاں، قبول، میر علی جاں شفق، بیخود، ہنر، عطارد، ہلال وغیرہ صدہا شعرا آپ کے دامن دولت سے وابستہ تھے۔(۱)

پروفیسر مسعود حسن رضوی ادیب مرحوم کے مطابق مصاحبان خاص شعرا کے نام اس طرح ہیں:۔

''بادشاہ نے پانچ شاعروں کو یعنی فتح الدولہ برق، مقبول الدولہ قبول، آفتاب الدولہ قلق، مہر الدولہ میر ذکی اور تدبیر الدولہ اسیر کو خلعت دے کر مصاحبان خاص کا امتیاز بخشا۔''(۲)

مثنوی ''حزن اختر'' میں خود واجد علی شاہ نے لکھا ہے:۔

کبھی سر پہ رکھتا تھا میں کج کلاہ — اودھ کا کبھی میں بھی تھا بادشاہ
فقط سترہ سو تھے اہل قلم — طبیبوں کو کر پانچ سو تو رقم
ملازم رہے میرے اے چرخ پیر — قبول و قلق طور و برق تو رقم

شوق خاص شعرا کی فہرست میں کہیں نظر نہیں آتے۔عام شعرا کی فہرست میں ان کا نام شامل ہوسکتا ہے۔لیکن ایسی صورت میں پانچ سو روپے تنخواہ کی بات مشکل ہی سے تسلیم کی جائے گی۔شعرائے دربار واجد علی شاہ کی فہرست کے بعد ان اطبا کی فہرست پر بھی نگاہ ڈال لی جائے جو دربار سے وابستہ تھے اور اپنی شہرت رکھتے تھے۔شرر کے مطابق:۔

''لکھنو نے حکیم مسیح الدولہ، حکیم شفاء الدولہ، حکیم سید مرتضی، حکیم مرزا کو چک،

---

(۱) ''خمخانہ جاوید، لالہ سری رام (جلد اول)، صفحہ ۲۱

(۲) ''لکھنو کا شاہی اسٹیج''، پروفیسر مسعود حسین رضوی ادیب

حکیم بنا، حکیم مرزا محمد جعفر کے ایسے عالی پایہ، گراں قدر طبیب پیدا کئے جو سچ یہ ہے کہ اپنے فنون کے مجتہد تھے اور سلف کے سارے سرمایہ علمی پر ان کی نظریں تھیں۔" (۱)

شرر کی اس فہرست میں شوق کا نام نہیں۔ حکیم محمد کاظم کی فہرست بھی دیکھتے چلئے، شاید شوق کا نام یہاں نظر آئے:-

"حکیم مرزا علی خاں، حکیم مرزا محمد علی، حکیم میر محمد، حکیم میر علی، حکیم احسان علی ناظم گونڈہ، حکیم میر باقر حسین، حکیم حیدر حسین، حکیم مرزا محمد جعفر، حکیم میر آغا حکیم میر مرزا، حکیم مرزا حسن، حکیم میر طالب علی، حکیم سید محمد خاں، حکیم مرزا محمد باقر، حکیم مرزا علی نقی، حکیم مرزا علی حسن خاں، حکیم مظفر حسین خاں، حکیم میر نواب، حکیم شیخ علی حسین، حکیم بنا، حکیم شیخ غلام نبی، حکیم آغا، حکیم شیخ علی محمد حکیم محمدی، حکیم یعقوب، حکیم محمد ابراہیم، حکیم مرزا کوچک، حکیم فتح علی، حکیم پناہ علی، حکیم آغا علی خاں، حکیم شاہ مرزا خاں، حکیم بندہ حسین، حکیم الہی بخش حکیم بندہ رضا خاں، حکیم میر محمود اور حکیم غضنفر۔" (۲)

لیکن نہیں! نواب مرزا شوق اطبا کی اس لمبی فہرست میں بھی جگہ نہیں پاتے۔ پھر تو ماننا ہوگا کہ وہ خاص حکیموں میں سے نہیں تھے۔ عام حکیموں کی فہرست میں ان کا نام ضرور ہوگا۔ پھر ایسی صورت میں پانچ سو روپیہ تنخواہ پانا مہمل نظر ہے۔ مگر آغا حجو شرف کے بیان کو کس خانے میں رکھا جائے۔ اس ضمن میں ڈاکٹر سید محمد حیدر کی توضیح دلچسپ سہی، لیکن قابل نقل

---

(۱) "گزشتہ لکھنؤ" عبدالحلیم شرر، صفحہ ۱۲۵

(۲) "رسالہ سوانح عمری" صفحہ ۱۳-۱۴

ہے، وہ لکھتے ہیں:۔

"شرف کے اشعار کا اگر بغور مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ شوق بادشاہی حکیم یقیناً تھے۔۱۸۵۶ء میں بادشاہی ختم ہوگئی اور انگریزوں کی حکومت قائم ہوئی۔شرف نے مثنوی ۱۸۷۳ء میں لکھی۔لہذا اگر بادشاہی حکیم لکھ دیا تو اس سے بادشاہ سے تعلق تو نہیں ثابت ہوا۔بادشاہ سے مراد یہ ہے کہ وہ دور بادشاہی کے قدیم حکیم تھے۔وہ عہد خلافت کے عائد میں سے تھے۔اس سے بھی تعلق ثابت نہیں ہوتا۔"(۱)

گویا عطا اللہ پالوی کے اس موقف کو تسلیم کرنے میں کوئی ہرج نہیں کہ شوق کا تعلق بادشاہ سے نہ تھا اور جب تعلق ہی نہ تھا تو پانچ سو روپے تنخواہ پانے کا کیا سوال۔

**شاعری اور تلمذ** :۔۔سعادت خاں ناصر مولف "تذکرہ خوش معرکہ زیبا" نے شوق کے بارے میں لکھا ہے:۔

"ارسطو زماں، فلاطوں دوراں، تصدق حسین خاں عرف حکیم نواب مرزا خلف آغا علی خاں برادر حکیم الملک حکیم مرزا علی خاں مرحوم، گو فن شاعری میں بہرہ نہیں، مگر پانچویں سواروں میں نام ملایا ہے، پیش طبیب منجم اور پیش منجم طبیب کا آپ ہی مزہ پایا ہے۔بے استاد تلمذ شعراء سے انکار ہے، خود استادی معلم الملکوت کا اقرار ہے، چنانچہ یہ چند غزلیں اور چار مثنویاں مسمی "زہر عشق"، "لذت عشق"، "فریب عشق"، "بہار عشق"، صاحب مسدس وخمسہ، تخلص ندارد و مقیم لکھنو۔"(۲)

---

(۱)"حیات شوق"، ڈاکٹر سید محمد حیدر، صفحہ ۷۶

(۲)"تذکرۂ خوش معرکہ زیبا"، مولف: سعادت خاں ناصر

مذکورہ تذکرہ کے متعلقہ صفحہ پر مرتب کا نوٹ قلم بند ہے:۔

"ان کا ذکر لکھنو کے نسخے میں نہیں ہے۔ اوپر جو کچھ لکھا گیا ہے، وہ پٹنہ کے نسخہ کے حاشیہ پر ملتا ہے، مگر اس میں بھی تخلص شوق نہیں لکھا ہے۔"(۱)

تذکرہ نگار کے انداز بیان سے صاف واضح ہے کہ یہ کسی دل جلے کی آواز ہے یا پھر شوق سے عداوت نبھائی گئی ہے۔ ورنہ اس قدر غلط بیانی سے کام نہیں لیا جاتا۔ "تذکرہ شوق" میں عطا اللہ پالوی نے بہ دلیل ثابت کیا ہے کہ اسے ناصر کے کسی شاگرد نے بعد میں لکھ کر شامل کر دیا۔ اول تو شوق کو ارسطو زماں و دوراں کے یہ طنزیہ فقرے ہیں۔ دوم نواب مرزا کے والد کا نام آقا علی خاں نہیں آغا علی خاں تھا۔ فن شاعری میں بہرہ نہیں، ایک بے بنیاد جملہ ہے۔ شوق کی مثنویاں ثابت کرتی ہیں کہ شوق ایک بڑے شاعر تھے۔ بے استاد تلمذ شعرا سے انکار ہے۔ خود استادی معلم الملکوت کا اقرار ہے۔ بے سر پیر کا جملہ ہے۔ شوق صاحب مسدس وخمسہ تھے۔ مگر اب ان کے خمسے دستیاب نہیں۔ ان کی چار مثنویوں کا ذکر کیا گیا ہے یعنی "زہر عشق"، "لذت عشق"، "فریب عشق" اور "بہار عشق" کا۔ مگر حقیقتاً شوق کی تین مثنویاں ہیں۔ تخلص ندارد، تو پھر "شوق" کیا ہے؟ غرض پورا اقتباس غلط بیانی پر مبنی ہے۔ لیکن یہیں سے ایک مسئلہ شوق کی شاگردی اور تخلص کے سلسلہ میں جنم لیتا ہے۔ مولانا عبدالماجد دریابادی لکھتے ہیں:۔

"شاعروں کی دنیا میں حکیم صاحب کا نام نواب مرزا شوق ہے اور ان کے نام کو قائم رکھنے والی ان کی غزلیں نہیں، مثنویاں ہیں۔ تذکروں میں ہے کہ خواجہ آتش کے شاگرد تھے، ہوں گے۔ لیکن یہ مثنویاں یقیناً یا تو استاد کے بعد کی

---

(۱) "تذکرہ خوش معرکہ زیبا" مولف: سعادت خاں ناصر، مرتبہ: شمیم انہونوی، صفحہ ۶۸۶

ہیں یا ان کی زندگی میں ان سے چرا چھپا کر کہی ہیں۔ ورنہ آتش کی نظر پڑنے کے بعد عجب نہیں کہ نذر آتش ہو جاتیں۔"(۱)

عبدالماجد دریابادی نے مثنوی کی عریانیت اور واشگاف نگاری کی بنیاد پر یہ قیاس کرلیا ہے کہ یہ مثنویاں آتش کے بعد یا ان سے چرا چھپا کر لکھیں گئیں۔ ورنہ آتش کی ثقاہت سے بعید نہیں تھا کہ یہ نذر آتش ہو جاتیں۔ مولانا کے خیال سے دوسروں نے بھی اپنے چراغ روشن کیے اور قیاساً ایک دوسری بات کہہ ڈالی، حالانکہ اس کا ٹھوس ثبوت موجود نہیں۔ "تذکرۂ شوق" کے مصنف نے لکھا ہے:۔

"جس زمانے میں نواب مرزا نے ہوش سنبھالا، لکھنو کا چمنستان سخن، بہترین زمزمہ پردازوں کے نغموں سے گونج رہا تھا۔ تقریباً ہر فرد بشر اس نشہ میں چور نظر آتا تھا۔ لہذا شوق بھی جرعہ کشی کیے بغیر نہ رہ سکے۔ فطرتاً موزوں طبع اور قدرتاً شاعر پیدا کیے گئے تھے۔ لہذا قواعد وضوابط کی معمولی ابتدائی کتابیں دیکھ کر جب شاعری کی طرف مائل ہوئے تو شوق تخلص اختیار کیا۔ اور رسماً ورواجاً اس عہد کے مشہور وممتاز شاعر خواجہ حیدر علی آتش لکھنوی کے شاگردوں کی فہرست میں نام لکھوالیا۔ یہ سلسلہ کب قائم ہوا اور کب تک باقی رہا، کچھ پتہ نہیں۔ مگر اندازیہ ہے کہ یہ رسماً مدت تلمذ بہت ہی مختصر ہوگی، کیونکہ دونوں استاد وشاگرد دو خیال، دو رجحان اور دو مسلک کے آدمی تھے۔ اس لئے بعض لوگ اس رشتہ سے بے خبر ہیں۔ چنانچہ ناصر لکھنوی کے تذکرہ میں شوق کو بے استاد کہا گیا ہے۔"(۲)

---

(۱) "اردو کا ایک بدنام شاعر"، مشمولہ: "کلیات شوق"، صفحہ ۳۶

(۲) "تذکرۂ شوق"، عطاالله پالوی

پتہ نہیں کہ عطا اللہ پالوی کو یہ قیاس کرنے کی کیوں ضرورت محسوس ہوئی۔ چلئے یہ بات تو صاف ہے کہ پالوی نے استادی اور شاگردی کے حوالے سے جو کچھ کہا۔ ہے وہ محض قیاس پر مبنی ہے، ساتھ ہی اس حقیقت کا اظہار کر دیا ہے کہ سلسلہ تلمذ کب قائم ہوا اور کب تک برقرار رہا، اس کے بارے میں واقفیت کم ہی ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ انہیں ناصر لکھنوی کے تذکرہ سے شوق پر بے استادی کا جو الزام عائد ہوتا ہے، اس کے لئے انہیں جواز اور تاویل کی ضرورت تھی۔ پالوی صاحب نے یہ تاویل ڈھونڈ نکالی ہے۔ یعنی یہ کہ استاد اور شاگرد دو خیال، دو رجحان اور دو مسلک کے آدمی تھے۔ یہاں عبدالماجد دریابادی کے خیال کی بازگشت سنی جا سکتی ہے۔ ڈاکٹر شاہ عبدالسلام لکھتے ہیں:-

"جب شوق نے ہوش سنبھالا تو ہر طرف شعر و سخن کی محفلیں آراستہ تھیں لکھنو کا شعری ماحول ایک خاص رنگ شاعری میں ڈوبا ہوا تھا۔ انشا، جرات، مصحفی وغیرہ کی محفلیں اور معرکے اکھڑ چکے تھے اور نئے دست و بازو اور نئے ذہن کے ساتھ ناسخ و آتش جیسے اساتذہ کا اکھاڑا جما ہوا تھا۔ ایک طرف تلامذۂ ناسخ اور دوسری طرف شاگردان آتش اپنے اپنے استادوں کی سرپرستی میں معرکے منعقد کرنے اور اپنی اپنی برتری منوانے میں کوشاں و سرگرداں تھے۔ ایسے رنگین ماحول میں لکھنو کا ہر فرد چاہے وہ باذوق ہو یا بے ذوق شاعری اور شعری محفلوں سے ضرور منسلک تھا۔ شوق بھی اسی معاشرے کے ایک فرد تھے۔ ماحول سے متاثر ہو کر شعر گوئی کی طرف رجوع ہوئے اور مشق سخن کرنے لگے۔ اپنے دور کے اساتذہ میں خواجہ آتش کا رنگ پسند آیا اور انہیں کی شاگردی اختیار کی، ابتدا میں صنف غزل میں طبع آزمائی شروع کی مگر کوئی خاص کامیابی حاصل نہ ہوئی۔ آخر کار غزل گوئی ترک کر کے مثنوی کی طرف رجوع ہوئے اور اپنی تین

معرکتہ الآرا مثنویاں "فریب عشق"، "بہار عشق" اور "زہر عشق" تصنیف کیں، جو شوق کی بقائے دائم کا سبب بنیں۔ بعض تذکرہ نگاروں کا بیان ہے کہ شوق اور خواجہ آتش میں کچھ اختلافات ہو گئے تھے جس کی وجہ سے بعد کو شوق نے اپنے استاد سے کنارہ کشی اختیار کر لی تھی۔ مگر اس بیان کا کوئی ثبوت دستیاب نہیں ہے۔ اس لئے یہ بیان قابل یقین نہیں ہے۔"(۱)

گویا استاد آتش سے شاگرد شوق کی کنارہ کشی کی بات غیر ثابت شدہ اور نا قابل یقین ہے۔ پھر سوائے ناصر لکھنوی کے کسی تذکرہ نگار نے بھی سلسلہ تلمذ ختم ہونے کا ذکر نہیں کیا ہے۔ راقم کی نگاہ سے جو تذکرے گزرے ہیں، کم از کم ان میں کہیں یہ بات نہیں اٹھائی گئی ہے۔ چنانچہ محسن لکھنوی کا تذکرہ "سراپا سخن"، عبدالغفور نساخ کا تذکرہ "سخن شعرا"، سرراس مسعود کا تذکرہ "انتخاب زریں"، نظامی بدایونی کا "قاموس المشاہیر"، لالہ سری رام کا "خمخانہ جاوید"، عبدالحی کا "گل رعنا" ڈاکٹر ابواللیث صدیقی کی تصنیف "لکھنو کا دبستان شاعری"، رام بابو سکسینہ کی "تاریخ ادب اردو"، حسرت موہانی کا تذکرہ "ارباب سخن"، منشی فدا علی عیش کا مجموعہ واسوخت "شعلہ جوالہ"، "تذکرہ شوق"، "کلیات شوق" اور "حیات شوق" میں بجا طور پر نواب مرزا شوق لکھنوی کو آتش کا شاگرد اور ان کا تخلص شوق بتایا گیا ہے۔

**مشاغل** :- نواب مرزا شوق کے مشاغل میں کم از کم وہ حرکتیں قطعی شامل نہیں ہیں جو ان کی مثنویوں کے ہیرو سے سرزد ہوتی ہیں، البتہ دو مشاغل کا ذکر کیا جا سکتا ہے۔ اول شاعری، اس لئے کہ لکھنو کا ماحول اس کے لئے کھاد کا کام کرتا تھا۔ پھر شوق کا عہد شاعری کے اعتبار سے بہترین دور تھا۔ دہلی سے لے کر لکھنو تک بڑے بڑے شعرا داد سخن

---

(۱) "کلیات شوق"، ڈاکٹر شاہ عبدالسلام، صفحہ ۱۵

دے رہے تھے۔ ماحول کے اقتضا سے اور کچھ اپنی طبع موزوں کی مناسبت سے شوق نے شاعری کا مشغلہ شروع کیا۔ مشاعرے منعقد ہوتے رہتے تھے۔ شوق ان میں شریک ہوتے۔ چنانچہ امیر کے یہاں مشاعرے میں شرکت کی بات گزشتہ صفحہ میں کی گئی ہے۔ شوق کا دوسرا مشغلہ طبابت تھا۔ وہ باضابطہ اپنا مطب چلاتے تھے۔ شوق نے بٹیر بازی، کبوتر بازی، کنکوے بازی، شکار یا دوسرے مشاغل میں حصہ لیا ہو، اس کا ثبوت کہیں سے نہیں ملتا۔

**تصنیفات اور کلام** :— عطا اللہ پالوی نے اپنی کتاب "تذکرۂ شوق" میں لکھا ہے :-

"شوق لکھنوی کی مثنویات سرمایہ ادبیات ہیں۔ مثنویوں کے علاوہ شوق کا کلام کیا اور کتنا تھا اس کے متعلق قطعی طور سے کچھ نہیں کہا جا سکتا، مگر اندازہ یہ ہے کہ جو وقت شوق نے شعر گوئی کو دیا وہ مثنوی نگاری میں ہی صرف ہوا۔ دوسری اصناف کی طرف انہوں نے کوئی توجہ ہی نہیں کی۔ تذکرہ خوش معرکہ زیبا میں شوق کو صاحب مسدس و خمسہ بھی کہا گیا ہے، مگر کہیں بھی اس کا کوئی نمونہ یا اس کا کوئی ذکر نہیں پایا جاتا۔ البتہ وقتاً فوقتاً خاص خاص موقعوں اور ضرورتوں سے کچھ شعر انہوں نے ضرور کہے تھے۔ چنانچہ جناب احسن لکھنوی نے اپنے مضمون میں لکھا ہے کہ "انھوں نے غزلیں بھی کہیں ہیں، مگر بہت کم اور محض بغرض تفنن"۔ مگر چونکہ ان کو کوئی خاص مرتبہ حاصل نہ تھا، اس لئے کچھ اشعار تو ادھر ادھر محفوظ رہ گئے اور کچھ ضائع ہو گئے۔" (۱)

"کلیات شوق" میں شاہ عبدالسلام صاحب نے لکھا ہے :-

---

(۱) "تذکرۂ شوق" عطا اللہ پالوی صفحہ ۴۷

''شوق کو ان کی مثنویات کی وجہ سے بقائے دوام حاصل ہوئی۔ اصل میں یہ مثنویاں ہی ان کا سرمایہ حیات ہیں۔ مثنویوں کے علاوہ ان کا کلام کیا اور کتنا تھا، اس کے متعلق صحیح طور سے نہیں کہا جا سکتا۔ متفرق اشعار، چند غزلیں اور ایک واسوخت اب تک دستیاب ہوئے ہیں'' (۱)

''تذکرۂ شوق'' میں پالوی صاحب نے مختلف تذکروں سے اکٹھا کر کے غزل کے کل ۴۳ اشعار شامل کیے تھے۔ ڈاکٹر عبدالسلام صاحب نے کچھ اور اشعار تلاش کیے۔ اس طرح شوق کی غزلوں کے اشعار کی مجموعی تعداد اکسٹھ تک جا پہنچی۔ انہوں نے ''کلیات شوق'' میں ان اشعار کو یکجا کر دیا ہے۔ ساتھ ہی ''شعلہ جوالہ'' حصہ دوم، مرتبہ: فدا علی عیش نے ۴۱ بند پر مشتمل ایک واسوخت بھی نقل کی ہے۔ پھر شوق کی تین مثنویاں ہیں، ''فریب عشق''، ''بہار عشق'' اور ''زہر عشق''۔

''حیات شوق'' کے مصنف نے لکھا ہے کہ شوق کا ایک قلمی دیوان بھوا نیت میں موجود تھا۔ لیکن اب وہ دستیاب نہیں ہوتا۔ انہوں نے باقر حسین صاحب رنگین کے حوالے سے شوق کا ایک اور شعر بھی نقل کیا ہے۔ وہ شعر یہ ہے:

رکھو نہ سینہ میت پہ ہاتھ چارہ گرو
سنا تھا درد اٹھ تھا اسی ٹھکانے سے

اگر یہ شعر واقعی شوق کا ہے تو پھر ان کے اشعار کی تعداد باسٹھ ہو جاتی ہے۔

**شوق کے معاصرین:** — یہ بات بار بار دہرائی گئی ہے کہ شوق کا عہد شاعری کا بہترین دور تھا۔ لکھنو میں آتش و ناسخ کا اکھاڑہ جمع تھا۔ دونوں اساتذہ کے

---

(۱) ''کلیات شوق''، شاہ عبدالسلام، صفحہ ۱۵

شاگردوں کی ایک بڑی تعداد دادِ سخن دے رہی تھی۔ لکھنو میں ناسخ، آتش، رند، وزیر، صبا، رشک، انیس، دبیر، جان صاحب، اسیر، جلال وغیرہ شعرا شوق کے ہمعصر تھے۔ دلی میں مومن، ذوق، ظفر، غالب، شیفتہ، داغ جیسے اساتذہ موجود تھے۔ گویا شوق نے شعری ماحول کے اعتبار سے بہترین زمانہ پایا تھا۔

**وفات** :۔ ''تذکرۂ شوق'' کے مصنف شوق کی وفات، عمر اور جائے دفن کے سلسلے میں لکھتے ہیں:۔

''نواب مرزا شوق نے ۱۲؍ ربیع الثانی ۱۲۸۸ھ مطابق ۳۰؍ جون ۱۸۷۱ء بروز جمعہ لکھنو میں بعمر ۹۱ سال انتقال کیا اور اس قبرستان میں جو اس وقت ریلوے لائن کے بالکل نیچے اسٹیشن کی طرف واقع ہے اور اس مخزن الشعرا میں جس میں ۱۷۸۰ء میں مرزا رفیع سودا، ۱۷۸۶ء میں میر غلام حسن، ۱۸۱۰ء میں میر تقی میر، ۱۸۱۷ء میں انشاء اللہ خاں انشا، ۱۸۲۴ء میں غلام ہمدانی مصحفی، ۱۸۳۰ء میں امام بخش ناسخ اور ۱۸۴۶ء میں خواجہ حیدر علی آتش کے سے باکمال افراد سپرد خاک ہوئے تھے، ۱۸۷۱ء میں شوق بھی دفنائے گئے۔''(۱)

ڈاکٹر گیان چند جین، امیر حسن نورانی اور ڈاکٹر شاہ عبد السلام نے بھی شوق کے وفات کی اس تاریخ کو نقل کیا ہے، لیکن ڈاکٹر سید محمد حیدر نے لکھا ہے:۔

''تقویم کی رو سے ۱۲؍ ربیع الثانی کو جولائی کی پہلی تاریخ اور دن شنبہ ہے۔ اگر تاریخ انتقال ۳۰؍ جون مان لی جائے تو اس روز ۱۱؍ ربیع الثانی پڑے گی۔ دن جمعہ ہوگا۔ شوق کی عمر وقت انتقال بہ حساب سن ہجری ۹۱ برس اور عیسوی سن کی

---

(۱) ''تذکرۂ شوق''، عطاء اللہ پالوی، صفحہ ۵۵

رو سے ۸۸ برس تھی۔"(۱)

اس طرح جائے دفن کے سلسلے میں بھی پالوی صاحب کے بیان کو شاہ عبدالسلام اور سید محمد عقیل صاحبان نے بلا تحقیق نقل کیا ہے۔ لیکن اس ضمن میں "حیات شوق" کے مصنف کی رائے مختلف ہے۔ وہ لکھتے ہیں:-

"اگر گورستان سے مراد شہر لکھنو ہے تو بیان صحیح ہے۔ لیکن اگر اس سے مراد وہی ریلوے لائن والا قبرستان ہے تو بات یقیناً غلط ہے۔ اس لئے کہ تمام شعرا جن کا ذکر انہوں نے (پالوی صاحب) نے کیا، اس قبرستان میں نہیں بلکہ لکھنو میں الگ الگ مقامات پر دفن ہیں۔"(۲)

ڈاکٹر صاحب موصوف نے "آب بقا" کے حوالے سے عبدالرؤف عشرت کے اس خیال سے اتفاق کیا ہے کہ:-

"نواب مرزا شوق نے لکھنو میں انتقال کیا ہے۔ مزار کربلا میں ہے۔"(۳)

یہاں کربلا سے مراد لکھنو کا کربلا ہے، جو راجہ ٹکیت رائے کے تالاب کے قریب واقع ہے۔ "نیا دور"، فروری، مارچ ۱۹۹۴ء کے "اودھ نمبر" میں ڈاکٹر کاظم علی خاں کا ایک مقالہ "اودھ میں اردو شاعروں کی آخری آرام گاہیں" کے عنوان سے چھپا ہے۔ اس میں شوق لکھنوی کے بارے میں جو کچھ لکھا ہے وہ "حیات شوق" کے حوالے سے ہی لکھا ہے۔ لیکن ساتھ ہی اس امر کی نشاندہی بھی کی ہے کہ یہ امر تحقیق طلب ہے۔ بہرکیف! ان کی

---

(۱) "حیات شوق"، ڈاکٹر سید محمد حیدر، صفحہ ۸۰

(۲) "حیات شوق"، ڈاکٹر سید محمد حیدر، صفحہ ۸۰

(۳) "آب بقا"، عبدالرؤف عشرت، صفحہ ۱۷۵

تفصیل ملاحظہ کیجئے:-

| | | |
|---|---|---|
| شوق لکھنوی | : | حکیم تصدق حسین خاں عرف نواب مرزا |
| وفات | : | ربیع الآخر ۱۲۸۸ھ، ۱۸۷۱ء |
| مدفن | : | کربلائے امداد حسین خاں لکھنو (تحقیق طلب) |
| ماخذ | : | ''حیات شوق'' ص۷۹ تا ص ۸۰ (۲) |

☆☆

---

(۱) ''نیا دور'' فروری، مارچ ۱۹۹۴ء، صفحہ ۹۱

نواب مرزا شوق

# مثنوی زہرِ عشق



# قصہ :

دوسرے مثنویوں کے مقابلہ میں یہ ایک مختصر مثنوی ہے۔ صرف پانچسو اٹھاون شعر کی۔ اِن پانچ سو اٹھاون شعروں میں جو قصہ بیان کیا گیا ہے، وہ اِتنا ہے کہ ایک شام مثنوی کا ہیرو بام پر سیر کر رہا تھا کہ نظر ایک ماہ جبین پر پڑی۔ جو سوداگر کی لڑکی تھی۔ جب نظر سے نظر ٹکرائی تو دلوں پر چھریاں چلیں۔ دونوں کے دِل گھائل ہو گئے۔ لیکن کیونکہ عشق کی آگ لڑکی کی طرف زیادہ تھی۔ اِسلئے وہ اپنے کو اظہارِ عشق کرنے سے روک نہ سکی۔ پھر کیا تھا۔ ملاقاتیں بڑھیں اور وہ ہوا جو نہیں ہونا چاہیئے تھا۔ یعنی سوداگر زادی کا دامن داغدار ہو گیا۔ خبر گھر تک پہونچی۔ گھر والوں نے اپنے کو رسوائی سے بچانے کے لئے اُسے بنارس بھیجنے کا ارادہ کیا۔

لڑکی کو جب معلوم ہوا کہ بات گھر تک پہونچ گئی ہے تو وہ اِس بدنامی کو برداشت نہ کر سکی۔ اور زہر کھا کر سو رہی۔ اُدھر جب ہمارے ہیرو کو معلوم ہوا تو اُنہوں نے فرض ادا کرنے کے لیے زہر کھا لیا۔ اُنہیں نہ مرنا تھا، نہ مرے۔

مجنوں گورکھپوری کا خیال ہے کہ اِس مثنوی میں قصّے کو اِتنا جلد بیان کیا گیا ہے، جس کی وجہ سے بے ربطی اور بے ترتیبی پیدا ہو گئی ہے۔ محبّت کا اِتنا جلد دل میں گھر کرنا اور پھر ختم ہو جانا کچھ عجیب سا لگتا ہے۔ یہ خیال تو فیصدی صحیح ہے۔ اِس کے علاوہ بے ربطی اور بے ترتیبی کے احساس کی ایک اور بھی وجہ ہے۔ اِس مثنوی میں ایسے ایسے شعروں کی تعداد اچھی خاصی ہے جن میں ایک ہی خیال کو بار بار باندھا گیا ہے۔ قاری ایک ہی خیال کے بار بار دہرائے جانے سے اُلجھن محسوس کرتا ہے۔

قصّے کے اعتبار سے اِس کی ایک خاص کمی یہ ہے کہ اِس میں قصّے کو ہیرو کی زبان سے کہلوایا گیا ہے۔ اگر اِس قصّے کے راوی مرزا شوق خود ہوتے تو یہ فائدہ رہتا کہ وہ جن کے حالات دکھلانے چاہتے، دکھا سکتے تھے۔ لیکن کیونکہ قصّہ ہیرو بیان کرتا ہے۔ اور جب ہیرو بیان کرتا ہے، تو وہ دوسروں کا حال کیسے بیان کر سکتا ہے؟ مثال کے طور پر جب ہیرو پر عشق پورا قبضہ جما لیتا ہے۔ تو اُنکی حالت بُری ہو جاتی ہے۔ وہ اپنی حالت کی عکاسی کرتے ہیں اور پھر ہیروئن کی حالت کا بیان کرنے لگتے

ہیں۔ جیسے دیکھ رہے ہوں۔

گزرا یاں تک تو یہ ہمارا حال
اب بیاں ہوتا ہے اُن کا احوال

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اُن کو ہیروئین کی کیفیت کا کیسے پتہ چل گیا۔ یہ بات فسانہ نگاری کے اصول کے خلاف ہے۔

مکالمہ نگاری کے لحاظ سے ایک اور خامی اِس مثنوی میں نظر آتی ہے۔ وہ یہ ہے کہ جب ہیروئین اپنے عاشق سے آخری بار ملنے آتی ہے تو ایک لمبی چوڑی وصیت اُس کو کرتی ہے۔ جب اُسکی وصیت ختم ہو جاتی ہے۔ تب عاشق صاحب اُس کا جواب دیتے ہیں۔ طویل وصیت کے دوران خاموش کھڑے رہنا غیر فطری لگتا ہے۔ حالانکہ وصیت میں بہت سے ایسے مواقع آتے ہیں۔ جہاں عاشق صاحب کو بولنا چاہیئے تھا۔ لیکن نہیں بولتے۔ اِس طرح مرزا شوق نے گفتگو کے اِس موقعہ کو مکالمہ نگاری کے لحاظ سے مصنوعی بنا دیا ہے۔

# ایک بڑی خوبی:

"زہرِ عشق" جس نے نیاز فتحپوری کو رُلا دیا، مجنوں گورکھپوری کی آنکھیں پُرنم کر دیں۔ اور سینکڑوں کے لیے موت کا باعث بنی؛ آخر کیوں ——— ؟ اِس کی صرف ایک وجہ ہے۔ اور وہ ہے اِس کا پُر اثر ہونا۔ اِسی اثر نے ہی اِس مثنوی کو "شاہکار" (بقول مجنوں)

اور "ماسٹر پیس" (بقول عبدالماجد دریابادی) بنا دیا ہے۔

جس زمانے میں مثنوی کو اسٹیج کیا جاتا تھا تو لوگ اُسے دیکھ دیکھ کر بے قابو ہو جاتے تھے۔ خاص طور سے اِس مثنوی کا وہ منظر جس میں ماہ جبیں کا جنازہ اور اُس کے غمزدہ والدین کا پچھاڑیں کھاتے چلنا دکھایا جاتا تھا۔ بہت اپیل کرتا تھا۔ تماشبین اُسے دیکھ کر زار و قطار رونے لگتے تھے۔ اور کچھ کمزور دل تو خودکشی کر لیتے تھے۔ اسی بنا پر مثنوی کی اشاعت اور اسٹیج پر دکھانا ممنوع قرار دے دیا گیا تھا۔ مجنوں صاحب نے بھی ایک ادھیڑ عمر بزرگ کا واقعہ بیان کیا ہے۔ جنہوں نے زہرِ عشق پڑھکر خودکشی کرنے کی کوشش کی تھی۔

مجنوں گورکھپوری کہتے ہیں کہ یہ مثنوی گوئٹے کی نظم "آلام ورتھر" کی طرح اثر رکھتی ہے۔ جسے پڑھکر آدمی موت اور زندگی کی تفریق بھول جاتا ہے۔ موت کا خوف اُس کے دل سے جاتا رہتا ہے۔ جرمنی سپاہی اسی لیئے اِس نظم کو اپنے ساتھ رکھا کرتے تھے۔ یہ اور بات ہے کہ "اِس کی کبھی آلام ورتھر کی طرح آزمائش نہیں کی گئی۔ ورنہ میرا خیال شاید غلط ثابت نہ ہوتا"

## اِس اثر کی وجہ :

"اِس مثنوی میں نہ تصوف کے رموز ہیں اور نہ ہی فلسفے کے نکات، اور نہ اِس کی زبان میں غالبیت یا مومنیت ہے۔ نہ اِس

کے واقعات میں کوئی ندرت یا اجنبیت۔ معمولی واقعات ہیں۔ جن کا تجربہ ہر خاص و عام کو ہو سکتا ہے۔ معمولی مگر دلنشیں انداز میں بیان کر دیئے گئے ہیں۔ اور پھر اس میں نہ صرف عشقیہ یا ازدواجی جذبات کا اظہار بڑی خوبصورتی سے کیا ہے بلکہ ماں باپ کے جذبات کی ترجمانی بھی اسی انداز میں کی گئی ہے۔" انہیں تمام چیزوں نے مثنوی کو موثر بنا دیا ہے۔

جو بھی اس مثنوی کو پڑھتا ہے، اس کا دل بھر آتا ہے۔ دل میں ہوک سی ضرور اٹھتی ہے۔ یہ اور بات ہے کہ خودکشی نہ کرے۔ یا نیاز فتحپوری کی طرح نہ روئے۔ یا مجنوں کی طرح آنکھیں نہ بھیگیں اس مثنوی کا سب سے متاثر کرنے والا حصہ وہ ہے، جب کہ ہیروئن اپنے عاشق کو وصیت کرتی ہے۔ اسے پڑھ کر کٹھور سے کٹھور دل بھی تڑپ اٹھتا ہے۔ یہ وہ منظر ہے جسے بقول ماجد شکسپیر بھی نہ پیش کر سکا۔ وہ کہتے ہیں:۔ "اگر کوئی ایسا منظر ہے جو اثر و عبرت انگیزی میں مرزا شوق کے کھینچے ہوئے نقشے کا مقابلہ کر سکے تو خدارا اسے پیش فرمایا جائے۔"

# کردار :

اس مثنوی کے تمام کردار بے نام ہیں۔ مجنوں صاحب نے ہیروئن کا نام ماہ جبیں تصور کر لیا ہے۔ ہمارے خیال میں ماہ جبیں اس لڑکی کا نام نہیں بلکہ یہ "نازنین" کے بدلے استعمال کیا گیا ہے

اگر واقعی لڑکی کا نام ماہ جبین ہوتا تو مرزا شوق کہیں اور بھی اُس کے نام کو ضرور دوہراتے۔

پوری مثنوی پر ہیروئن کا کردار چھایا ہُوا ہے۔ یہ ایک وفا پرست لڑکی کی خونین داستان ہے۔ جس کی قسمت میں محرومیاں اور ناکامیاں لکھی تھیں۔

عبدالماجد دریا آبادی اِس لڑکی کے کیریکٹر پر شک وشبہ کی نظر ڈالتے ہیں۔ اور اُس کو عصمت مآب ماننے کے لئے تیار نہیں دُوسری طرف مجنوں صاحب اُس کو کوئی بازاری عورت ماننے کے لئے تیار نہیں۔ اور حقیقت بھی یہی ہے۔ "زہرِ عشق" کی ہیروئن ایک عالی خاندان، شریف اور دولت مند سوداگر کی اکلوتی بیٹی تھی۔ پڑھی لکھی، نہایت حسین، خوش گلو، خوش تقریر۔

وہ پیار کا مجسمہ تھی۔ اُس کے مزاج میں رنگینی اور دل میں پیار ہی پیار بھرا تھا۔ سہیلوں کے ساتھ آسمان کی بہار دیکھنا اُسے بھاتا تھا۔ "رگوں میں سیماب دشی تھی۔ ریشہ ریشہ میں ایک خروشِ محبت تھا۔ جس کو اپنے مرکز کی تلاش تھی۔ وہ مرکز اُس کے سامنے کے کوٹھے پر مِلا۔" یہ اور بات ہے کہ غلط مِلا۔ لیکن اُس نے اُس کو ٹھیک سمجھا۔ اور پھر وہی ہُوا جو کاتبِ تقدیر نے لکھ دیا تھا۔ اُسے اُلفت ہوگئی اور پھر یہی اُلفت اُس کی موت کا باعث بنی۔

وہ ایک طرف اگر معصوم تھی تو دُوسری طرف تیز وطرار بھی تھی اُس نے اپنے عاشق کو محبت نامہ بھیجا۔ عاشق کی باچھیں کھل

گئیں۔ جواب میں عاشق نے اُسے یہ لمبا چوڑا خط لکھ مارا۔ اور اُس میں وصل کی بھی خواہش ظاہر کردی۔ ہیروئن کو اپنے عاشق کی اِس افتادگی پر بڑا مزا آیا۔ پھر دُوسرے خط میں خفگی کی خوب خوب کھنچائی کی۔ اور اُس میں کچھ ایسی بھی باتیں لکھدیں، جن سے بازاری پن ٹپکتا تھا۔

وہ وفا کی دیوی تھی۔ اُس نے اپنے عاشق کے ساتھ دغا نہیں کی۔ اُسے دھوکا نہیں دیا۔ جتنے وعدے کئے سب کو آخری سانس تک نباہ دیئے۔

اُس نے پیار کیا۔ جب اُس کی پیار کی داستان عام ہونے لگی تو وہ کانپ کانپ گئی۔ قربان جائیے ایسی شرم دنیا پر، لعنت بھیجئے دُنیا پر، جو پیار کو گناہ سمجھتی ہے۔

مجنوں گورکھپوری افسانوی دُنیا میں تین ہستیوں سے متاثر ہوئے۔ ایک اپنا کرنیا۔ دُوسری منیژہ اور تیسری یہی لڑکی ——— جس کے حوصلۂ عشق کا صحیح اندازہ نہیں کیا جا سکتا۔ ایک کمسن لڑکی ہے لیکن بلا کی باہمت اور پُر استقلال۔ وہ جانتی ہے کہ چند گھنٹے بعد اِس دُنیا میں نہیں رہے گی۔ لیکن اِس کے باوجود اُس کے چہرے پر گھبراہٹ، ہراس اور سراسیمگی کی کی کوئی علامت نہیں۔ نہ موت کا غم ہے اور نہ ہی دُنیا سے چھوٹ جانے کا۔

"زہرِ عشق" کی ہیروئن کو اکثر لوگ بے حیا کہتے ہیں۔ یہ کہنا کسی طرح بھی درست نہیں۔ اگر پیار کرنا بے حیائی ہے۔ اگر کسی

کے پیئے آنسو بہانا دیدے کا پانی ڈھل جانا ہے تو واقعی وہ بے حیا تھی۔ محبت کا نشہ لڑکی کے رگ و پے میں ساری ہے موت کا اندھیرا چھا رہا ہے۔ کائنات کی فضا سوگوار ہے۔ اس عالم میں بھی اس کو اپنی عزتِ نفس کا خیال ہے۔ محبوب سے وصیت کرتے ہوئے کہتی ہے۔

آپ کاندھا نہ دیجیئے گا مجھے
سب میں رسوا نہ کیجیئے گا مجھے
ذکرِ شکر مرا نہ رو دینا
میری عزت نہ یوں ڈبو دینا

ایسی لڑکی کو کس طرح بے حیا کہا جا سکتا ہے۔ ہاں ایک بات ضرور اِس کردار کے متعلق کہی جا سکتی ہے۔ وہ یہ کہ ایک نرم، نازک، کمسن لڑکی کے منہ سے بے ثباتی دنیا کے متعلق تقریر کچھ بھلی نہیں معلوم ہوتی۔

اِس مثنوی کا دوسرا اہم کردار ہیرو کا ہے۔ مرزا شوق ہیرو کے بارے میں کسی قسم کی کوئی معلومات بہم نہیں پہونچاتے حتیٰ کہ نام تک نہیں بتاتے۔ کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ ہیرو کے روپ میں خود مرزا شوق نے اپنے کو پیش کیا ہے۔ یہ بات غلط ہے پوری مثنوی پڑھ جائیے۔ اِس میں ایک شعر بھی ایسا نہیں ملیگا جس سے یہ ثابت ہو سکے کہ ہیرو کے نقاب کے پیچھے مرزا شوق ہیں۔ اگر مرزا خود اپنے کو پیش کرتے تو یہ ناممکن تھا کہ وہ اپنی زندگی کے واقعات کو نظم کیئے بنا رہ جاتے۔ خیر صاحب! ہمیں اِس

سے کیا کہ اِس کا ہیرو کون ہے ؟ مرزا شوقؔ یا کوئی اور ؟ بہرحال ہے اور بغیر نام کے ہے ۔ ہم اُس کے بارے میں کچھ بھی نہیں جانتے ۔ بس اِتنا جانتے ہیں کہ اُس کی ایک ماں ضرور ہے ۔ باپ ہے یا نہیں ؟ ہمیں نہیں معلوم ۔

سوداگر کی لڑکی سے جب آنکھ مِلتی ہے تو آپ پر غشی طاری ہونے لگتی ہے ۔ لیکن خُدا کا شکر ہے کہ آپ اپنے کو سنبھال لیتے ہیں ۔ ( اگر بے ہوش ہو جاتے تو کوئی اُن کا کیا کر لیتا ) ۔ یہ اور بات ہے کہ آنکھوں سے آنسوؤں کی جھڑی لگ جاتی ہے ۔ وہ اُن کے دام میں آجاتی ہے ۔ عِشق کے ہاتھوں مجبور ہو کر اُنہیں خط لکھتی ہے ۔ یہ جواب میں خط لکھتے ہیں ۔ جس سے اِن کے عِشق کی سچائی ظاہر ہو جاتی ہے ۔

اب میں لکھتا ہوں آپکو یہ حضور
وصل کی فکر چاہیئے ہے ضرور

یہ تھا اُن کا عِشق جو بوالہوسی پر مبنی تھا ۔ اُنہیں سوداگر کی لڑکی کے بجائے اُس کے جسم سے پیار تھا ۔

جہاں آپ کا عِشق کمزور ہے وہاں عقل بھی ۔ ہیروئن کا جب اِن کے یہاں آنا جانا ہو جاتا ہے ۔ اور آمد و رفت زیادہ بڑھ جاتی ہے تو اس کا پتہ گھر والوں کو چل جاتا ہے ۔ نتیجے میں مُلاقاتیں بند ہو جاتی ہیں ۔ اور پھر وہ ڈیڑھ مہینے تک اُن کے پاس نہیں آپاتی ۔ لیکن یہ حضرت اُس سے مِلنے کی کوئی ترکیب نہیں نِکالتے ۔ بس سوچ سوچ کر رہ جاتے ہیں ۔

کون ایسا ہے جائے گھر اُس کے
کس کو بھیجوں مکان پر اُس کے

کیا ہم ہیرو سے یہ پوچھ سکتے ہیں کہ اُنہوں نے اپنا خط کس طرح بھیجا تھا!

نیاز فتحپوری کو ہیرو کا زہر کھا کر بچ جانا کچھ اچھا نہیں لگتا لیکن یہ خیال اُنکی جوانی کا ہے۔ اب وہ اس کو نہ خلافِ حقیقت اور نہ خلافِ اصُول سمجھتے ہیں۔ کیونکہ "عشق و محبت کی دُنیا میں مرد نے ہمیشہ اپنی اِسی سیرت کی نمائش کی ہے" اپنے اِس بیان میں وزن پیدا کرنے کے لئے بلاوجہ فرہاد پر شک کرتے ہیں۔

ہمیں نیاز فتحپوری کے جوانی والے خیال سے پورا پورا اِتفاق ہے بُڑھاپے والے خیال سے اختلاف (ہو سکتا ہے کہ بُڑھاپے میں ہمارا بھی خیال بدل جائے)۔ ہیروئن کی موت کے بعد ہیرو کو ضرور مر جانا چاہیئے تھا۔ اور اگر وہ مر جاتا تو یہ بات خلافِ فطرت ہرگز نہ ہوتی۔ ایک وفا پرست لڑکی جس نے اُس کی خاطر اپنی ہستی خاک میں مِلادی لیکن اُن حضرت پر اس کا کوئی اثر نہ ہُوا۔ بھلا ہو مرزا شوق کا کہ اُنہوں نے زہر کھِلا دیا۔ ورنہ دُنیا والے کیا کہتے ——— اِنہیں نہ مرنا تھا اور نہ مرے۔ مرتے وہ ہیں، جو شرم دار ہوتے ہیں۔ شرم اُنہیں میں ہوتی ہے جو حسّاس ہوں۔ ہمارا ہیرو بے حیا ہے۔ بُزدل ہے۔ اِس لئے نہیں مرا۔

مرد بے وفا ہو سکتا ہے۔ لیکن سارے مرد نہیں۔ مرد بے شرم، بے حس ہو سکتا ہے، لیکن سارے مرد نہیں۔ مردوں نے

عشق میں اپنی جانیں قربان کی ہیں۔ یاد کیجیے مہینوال کو سوہنی کے ساتھ چناب میں ڈوب مرا تھا۔ اگر وہ بے وفا، بزدل، بے شرم، بے حس ہوتا تو دریا کے کنارے کھڑا کھڑا سوہنی کے ڈوبنے کا نظارہ کرتا رہتا۔ یا اُلٹے پاؤں گھر کو بھاگ لیتا۔ اِس لئے یہ کہنا سچ نہیں کہ "عشق و محبت کی دُنیا میں مرد نے ہمیشہ اِس سیرت کی نمائش کی ہے" اِس سیرت کی نمائش ہمارے اِس ہیرو کی ہے۔ اور اُس نے اِس لئے کی ہے کہ بے حیائی، بزدلی اُس کے کیریکٹر کی بڑی خصوصیت ہیں۔ اگر وہ مرجاتا تو یہ بات خلافِ فطرت ہرگز نہ ہوتی۔ اُس کا جینا بھی عین فطرت کے مطابق ہے۔

جہاں جہاں ہیرو کا ذکر کیا گیا ہے اُس کی اِس خصوصیت (بے حسی) کو ضرور اُجاگر کیا گیا ہے۔ جب ہیروئن اُس سے رخصت ہونے آتی ہے تو جاتے وقت اُس سے بہت کچھ کہتی ہے۔ لیکن اُس کی بے حسی بدستور قائم رہتی ہے۔ اور زبان سے ایک جملہ بھی ایسا نہیں نکلتا، جس سے جوش و خروش اور شدتِ تاثر ظاہر ہو۔ آپ کہتے ہیں۔

جان دے دوگی جو تم کھا کے سم
میں بھی مرجاؤں گا خُدا کی قسم
جو یہ دیکھے گا خوب روئے گا
آگے پیچھے جنازہ ہوئے گا

یہ جواب ظاہر داری، بے تاثری، بے حسی پر مبنی ہے۔ آگے چل کر ہیرو نے اخلاقی درس بھی دیا ہے۔ اور اِس میں ماں باپ

کے حقوق واضح کرنے کی کوشش کی ہے، اگر ہیرو کے دل میں وہی جوش وہی درد، وہی کسک، وہی پیار ہوتا جو ہیروئن کے دل میں تھا تو یہ اخلاقی درس ہیرو کے منہ سے نکل ہی نہ سکتا تھا۔ بقول نیاز یہ وقت اخلاقی درس دینے کا نہیں ہوتا۔ بلکہ دیوانہ وار اندھوں کی طرح آگ میں کود جانے کا ہوتا ہے۔

مرزا شوق ہیرو کو زہر کھلاتے ہیں۔ اور کھلانے کے بعد بچا بھی دیتے ہیں۔ اور اس بچانے کی جو صورت نکالتے ہیں، وہ بے حد مصنوعی معلوم ہوتی ہے۔

انوار منیر۔
نور منزل، رسل گنج۔
علی گڑھ۔

[illegible]

شوق لکھنوی

# زہرِ عشق

مرتبہ: ڈاکٹر عطیہ نشاط

# مقدمہ

نواب مرزا شوق لکھنوی کا پورا نام تصدق حسین خاں تھا اور عرف نواب مرزا تھا۔ ان کی ولادت لکھنؤ میں ۱۷۸۳ء / ۱۱۹۷ھ میں ہوئی۔ ان کا خاندان حکیموں کا مشہور خاندان تھا اور ان کے والد، چچا، دادا وغیرہ مشہور طبیب تھے۔ خود نواب مرزا نے بھی بڑھ کر یہی پیشہ اختیار کیا اور لکھنؤ کے صاحب حیثیت لوگوں میں شمار کیے جاتے تھے۔ شاعری میں انھوں نے آتش کی شاگردی اختیار کی لیکن معلوم ہوتا ہے کہ استاد اور شاگرد کی طبیعتوں میں اتنا اختلاف تھا کہ یہ سلسلہ زیادہ دنوں تک قائم نہیں رہا۔ چند تذکروں میں ان کی غزلوں کے بھی کچھ اشعار ملتے ہیں لیکن ان کا سرمایۂ حیات تین مثنویاں فریبِ عشق، بہارِ عشق اور زہرِ عشق ہیں۔ بعض لوگوں نے لذّتِ عشق اور خنجرِ عشق کو بھی ان کے نام سے منسوب کیا ہے لیکن عطا اللہ پالوی نے یہ ثابت کر دیا ہے کہ انھوں نے صرف تین ہی مثنویاں لکھی ہیں۔ ان کا انتقال ۱۸۷۱ء / ۱۲۸۸ھ میں لکھنؤ میں ہوا۔

زہرِ عشق مرزا شوق کی آخری مثنوی ہے جو انھوں نے ۱۸۶۱ء / ۱۲۷۷ھ میں لکھی۔ انداز بیان کی روانی، محاوروں کی خوبی اور دوسری فنی خصوصیات کی وجہ سے اس کا شمار اردو کی بہترین مثنویوں میں کیا جاتا ہے اور مشہور ناقدوں نے اس کی تعریفیں کی ہیں۔ الطاف حسین حالی اپنے مشہور مقدمے میں یوں رقم طراز ہیں:۔

"اگر شاعری کی حیثیت سے دیکھا جائے تو ایک خاص حد تک ان (شوق کی مثنویوں) کو بدرِ منیر (مثنوی سحرالبیان) پر ترجیح دی جاسکتی ہے وہ قدیم الفاظ اور محاوروں سے جواب تک

متروک ہو گئے ہیں اور جشنو اور بھرتی کے الفاظ سے پاک ہیں۔ ان کا مرتبہ ان میں ایک قسم کا بیان، زبان کی گھلاوٹ، روزمرہ کی صفائی، قافیوں کی نشست اور مصرعوں کی برجستگی کے لحاظ سے بمقابلہ بدرمنیر کے بہت بڑھا ہوا ہے ان میں مردانے اور زنانے محاورے کو اس طرح برتا ہے کہ نثر میں بھی اس بے تکلفی سے آج تک کسی نے نہیں برتا۔"[1]

ڈاکٹر خواجہ احمد فاروقی نے مرزا شوق کی مثنوی نگاری اور فنی مہارت کے بارے میں یوں لکھا:

"زبان، منظرکشی، جذبات نگاری اور نفسیاتی واقعات کا اعجاز نظر آتا ہے۔ بعض اخلاقی مضامین مثلاً دنیا کی ناپائداری اور بے ثباتی کے نہایت اعلیٰ مرقع ملتے ہیں روزمرہ اتنی صفائی کے ساتھ دوسری جگہ مشکل سے نظر آئے گا۔ اسی طرح عورتوں کی زبان بالکل انھیں کے انداز میں پیش کی گئی ہے اور مرزا نے اس کا بھی پورا حق ادا کر دیا ہے۔ زبان اور بیان کے لحاظ سے ساری مثنوی پڑھنے اور لطف لینے کے لائق ہے۔"[2]

وقار عظیم زہر عشق پر اس طرح رائے ظاہر کرتے ہیں۔

"بعض ادبی اور فنی کارنامے ایسے ہوتے ہیں جو اکثر فنی مطالبات کو پورا نہیں کرنے کے باوجود ان کی عظمت کے آگے فن اعتراف عجز و شکست کرتا ہے۔ کبھی کبھی زندگی کی بے پوش حقیقتیں فن کی ہر نزاکت سے نازک تر ہوتی ہیں۔ اسی طرح کی عظمت اور نزاکت زہر عشق کے حصے میں آئی ہے اور اس کی وجہ سے وہ بے مثال کسک بھی ہے جو محبت کی محرومی، بے بسی اور بے چارگی نے مہ جبیں کی باتوں میں پیدا کر دی ہے۔"[3]

مجنوں گورکھپوری نے مرزا شوق اور گوئٹے کا موازنہ کرتے ہوئے یوں لکھا ہے:۔

"زہر عشق کو اُردو ادب میں وہی مرتبہ دینا چاہئے جو جرمن ادب میں فلسفی

---

[1] حالی: مقدمہ شعر و شاعری۔ ص۲۲۳ [2] خواجہ احمد فاروقی: ذوق و جستجو ص۱۹۲
[3] وقار عظیم: "روح ادب" کراچی چھٹے سال کا دوسرا شمارہ ص۴۹

افسانہ نگار گوئٹے کے (Sorrows of Werther) کو ملا ہے۔ واقعات اور ترتیب واقعات کے لحاظ سے زہر عشق اور "آلام ورتھر" میں کوئی مناسبت نہیں سوائے اس کے کہ دونوں میں زندگی کا انجام یکساں ہے۔ زہر عشق میں ایک دنیا اور دنیا کی آزمائشوں سے بے خبر لڑکی اپنے جذبات عشقیہ سے مغلوب ہو کر خودکشی کرتی ہے اور آلام ورتھر میں ایک نوجوان مرد جو علاوہ عشق کی مایوسیوں اور طرح طرح کی ناکامیوں اور محرومیوں کے ہاتھوں زندگی سے بیزار ہو جاتا ہے اور آخرکار جان دے کر تمام جھگڑوں سے نجات حاصل کرتا ہے لیکن اثر کے اعتبار سے زہر عشق اور آلام ورتھر دونوں ایک پایہ کی چیزیں ہیں۔ دونوں کے پڑھنے سے کم از کم وقتی طور پر انسان زندگی اور موت کی تفریق بھول جاتا ہے۔ موت کا ہول نہ صرف دل سے نکل جاتا ہے بلکہ دار و رسن کا اشتیاق پیدا ہو جاتا ہے"۔ [1]

نیاز فتح پوری نے مثنوی زہر عشق کے بارے میں اپنی رائے اسی طرح ظاہر کی ہے:۔

"جو درجہ زہر عشق کو حاصل ہوا وہ کسی اور (مثنوی) کو نصیب نہیں ہوا۔ اور اس کی پسندیدگی میں آنسوؤں کا جتنا خراج نواب مرزا شوق کو مل چکا ہے وہ قدر و قیمت میں اس سے کہیں زیادہ ہے کہ ان کا منہ اس کے انجام میں موتیوں سے بھر جاتا۔"

پروفیسر آل احمد سرور کی رائے اس طرح ہے:۔

"لکھنؤ کی بہترین مثنوی گلزار نسیم بتائی جاتی ہے مگر میرے خیال میں شوق کی زہر عشق کو یہ درجہ دینا چاہیے۔ لکھنؤ کی ساری مثنویوں میں سب سے زیادہ روشن اور تھرتھراتی ہوئی تصویریں شوق کی مثنویوں میں ملتی ہیں۔"

حقیقت یہ ہے کہ نواب مرزا شوق کا سماجی شعور ان معنوں میں بہت گہرا تھا کہ انہوں نے زمانے کی معاشرت اور اس کے مختلف پہلوؤں کو اچھی طرح سمجھا تھا۔ اس کے ساتھ ہی زبان

---

[1] مجنوں گورکھپوری۔ زہر عشق ص ۳۳

اور بیان پر انھیں ایسی قدرت بھی حاصل تھی کہ وہ مختلف جذبات و محسوسات کو کامیابی سے پیش کر سکیں۔ ان کے زمانے کے شاعر تناسب لفظی اور مضمون آفرینی کے گرویدہ تھے اور ناسخ کا رنگ سخن حاوی تھا۔ صنائع و بدائع کا استعمال، نئے نئے قافیوں اور مشکل زمینوں میں زیادہ اشعار کہہ کر اپنی قدرتِ کلام کا مظاہرہ کرنا بھی اس دور کی خصوصیت ہے۔ دیا شنکر نسیم کی مشہور مثنوی گلزار نسیم اسی لیے لکھنؤ اسکول کی نمائندہ مثنوی کہی جاتی ہے کہ اس میں صنائع و بدائع کا استعمال بہت زیادہ ہے اور رعایت لفظی سے کلام کا حسن بڑھایا گیا ہے۔ ایسے ماحول میں بے تکلف زبان میں محسوسات و جذبات کا بیان ایسی خصوصیت ہے جس نے شوق کو ایک نیا میدان دیا اور اس میدان میں انھوں نے اپنے شعور سے ایسا راستہ نکالا جس نے دو انسانوں کی داستانِ محبت کو درد اور کسک سے بھر کر اُسے لافانی بنا دیا۔

نواب مرزا شوق نے اپنے عہد کی زندگی کو بہت قریب سے دیکھا اور متوسط طبقے کی روزمرہ زندگی کی ایسی تصویر پیش کی جس میں حقیقی زندگی کی دھڑکن موجود ہے۔ جو لوگ پڑھتا ہے اسے کہانی کے ہیرو اور ہیروئن کے جذبات و واقعات اپنے ارد گرد کے واقعات سے ملتے جلتے دکھائی دیتے ہیں اور یہی وجہ ہے کہ ان کی تاثیر دوسری مثنویوں سے کہیں زیادہ ہے۔ سحر البیان اور گلزار نسیم میں دیو پریوں کی کہانیاں، جادو اور طلسم کے ذکر سے اس کے کردار ایک حد تک اپنے سے دور معلوم ہوتے ہیں۔ میر کی مثنوی دریائے عشق اور شعلہ عشق میں اگرچہ کردار عام زندگی سے لیے گئے ہیں لیکن ان کے ساتھ پیش آنے والے واقعات غیر فطری اور ایک حد تک مافوق الفطرت ہیں۔ مصحفی کی مثنوی بحر المحبت کا قصہ بھی دریائے عشق کا قصہ ہے۔ میر اثر کی مثنوی خواب و خیال بھی اسی طرح کی ہے۔ غرض زہرِ عشق کے کردار اور ماحول چونکہ ہمارے ذہن سے بہت قریب ہیں اور پردے کی رسم کی پابندی کرنے والی سوسائٹی میں محبت کی راہ میں رکاوٹیں اور اُن کی گھٹن ایک عام بات ہے اس لیے پڑھنے والے زہرِ عشق

کے کرداروں اور واقعات سے ذہنی ہم آہنگی محسوس کرتے ہیں۔

زہرِ عشق پر عریاں نگاری کا اعتراض بھی کیا گیا ہے حالانکہ اس میں جن مناظر کی تفصیلات پر اعتراض کیا گیا ہے وہ باتیں اُردو غزل میں عام ہیں۔ میر اثر کی خواب و خیال میں بھی بعض مناظر صفائی اور بے باکی سے پیش کیے گئے ہیں۔ نظیر اکبر آبادی کی نظموں کے علاوہ بہت سے ناولوں اور افسانوں میں جو بیانات ملتے ہیں وہ زہرِ عشق سے کہیں زیادہ عریاں کہے جا سکتے ہیں۔ اس سلسلے میں عطاء اللہ پالوی کہتے ہیں:

"جس طرح یورپ میں ایمیل زولا اور موپاساں وغیرہ اس حقیقت نگار اسکول کے علمبردار تھے کہ سوسائٹی کی تمام مذموم، قبیح اور شرمناک اخلاقی کمزوریوں اور خرابیوں کو اس قدر واضح کر دو کہ ان کی عریانیت دیکھ کر طبیعت خود متنفر ہو جائے اسی طرح مشرق میں لکھنؤ کے اندر شوق کا نظریہ تھا۔ یہ مثنویاں لکھنے کا مقصد یا مطمحِ نظر صرف یہی تھا کہ ان کا یہ کارنامہ ردِّ عمل میں معاون ہو اور یہ مثنویاں اہلِ لکھنؤ کے لیے درسِ عبرت کا کام دیں۔" [1]

اسی بنا پر انھوں نے شوق کی مثنویوں کو عریاں اور بداخلاق ٹھہرانے کے بجائے اخلاقی تعلیم کا ذریعہ قرار دیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

"سب سے اہم خوبی شوق کی مثنویوں کی یہ ہے کہ وہ معلمِ اخلاق اور مصلحِ معاشرہ ہیں۔ انھوں نے اپنی مثنویوں میں اپنے عہد کا کچا چٹھا اسی لیے پیش کیا ہے کہ اپنے عہد کی لکھنؤ کی عیاشانہ معاشرت کو مطعون کر کے اس کی درستی کی جانب لوگوں کو متوجہ کریں۔ اپنے یہاں کی فرسودہ تہذیب کی تنقیص کر کے اس کی اصلاح کی طرف لوگوں کو مائل کریں۔ یہ خوبی بجز شوق کی مثنویوں کے اُردو زبان کی اور کسی

---

[1] عطاء اللہ پالوی: تذکرہ شوق ص ۱۶۳ [2] عطاء اللہ پالوی: تذکرہ شوق ص ۱۸۵

بھی مثنوی میں نہیں پائی جاتی'' لہ

فنکار زندگی کا ترجمان ہوتا ہے اور اس کی تفصیلات، اس کی باریکیاں، محسوسات و جذبات سب اسی کے دائرۂ اثر میں آتے ہیں۔ ان کی صحیح پیش کش حقیقت نگاری کے دائرے میں آتی ہے۔ شاعر کو حقایق سے نظریں نہیں چرانا چاہیے ورنہ اس کا فن ادھورا رہ جائے گا۔ اتنا ضرور ہے کہ کوئی تفصیل یا کوئی بیان صرف اس لیے نہیں ہونا چاہیے کہ اس سے لذت اندوزی مقصود ہو۔ زہر عشق اس نقطۂ نظر سے دیکھا جائے تو وہ زندگی کی دھڑکنوں کی داستان ہے اس کی مسرتوں اور محرومیوں کی کہانی ہے جسے نواب مرزا شوق نے ماہر فنکار کی طرح پیش کیا ہے

## ایک غلط روایت

نگار فروری ۱۹۳۸ء میں مرزا شوق کے نواسے احسن لکھنوی کا ایک مضمون "زہر عشق کیوں کر وجود میں آئی" شائع ہوا۔ جس میں انھوں نے لکھا ہے کہ ان کی نانی یعنی مرزا شوق کی بیوی نے بچپن میں ان سے بتایا تھا کہ ایک شخص اپنی بیوی ستارہ کو ان کے یہاں چھوڑ کر کہیں باہر چلا گیا تھا۔ مرزا شوق کے سالے مرزا عباس اور ستارہ میں محبت ہو گئی۔ کافی عرصے کے بعد ستارہ کا شوہر اپنی بیوی کو واپس لینے آگیا اور ستارہ کو اس گھر سے رخصت ہونا تھا۔

"اس رات کو جس کی صبح کو ستارہ رخصت ہونے والی تھی حکیم صاحب (مرزا شوق) کی آنکھ کھلی اور کسی ضرورت سے باہر نکلے۔ جب مرزا عباس کے کمرے کے قریب سے گذرے تو باتیں کرنے کی بھنک ان کے کان میں پڑی۔ انھوں نے اور قریب جا کر دروازے سے کان لگائے تو معلوم ہوا کہ مرزا عباس اور ستارہ

---

لہ عطاء اللہ پالوی: تذکرۂ شوق۔ ص ۱۸۵

آپس میں باتیں کر رہے ہیں اور اس تاثر کے ساتھ کہ نواب مرزا صاحب بہت متاثر ہوئے۔ ستارہ رو رو کر اپنے جذبات کا اظہار کر رہی تھی اور مرزا عباس اس کو تسکین دے رہے تھے۔ حکیم نواب مرزا صاحب پر اس واقعہ سے ایسا اثر ہوا کہ وہ اپنے اندر ایک خاص جذبۂ شعر گوئی محسوس کرنے لگے اور اسی جگہ جو تاثرات ان کے اندر پیدا ہوئے اُن کو کوئلے سے بنگلے کی دیواروں پر لکھنا شروع کیا......

مرزا عباس اور ستارہ کی ملاقات ایک نہایت خونیں صبح کے انتظار میں صرف ہو رہی تھی۔ جب صبح کے وقت یہ حقیقت واضح ہوئی کہ" زہر غم کر چکا ہے اپنا کام اور ستارہ نزع کے عالم میں ہے تو سب کو سخت صدمہ ہوا اور آخر کار اس کے شوہر کو جو بنارس کا رہنے والا تھا مایوس جانا پڑا۔"

اگرچہ یہ روایت ایک نانا کے بارے میں انھیں کے نواسے کی طرف منسوب ہے پھر بھی اسے غلط اور فرضی سمجھنے کی معتبر دلیلیں ہیں جنھیں عطاء اللہ پالوی نے پیش کیا ہے اختصار سے انھیں ذیل میں بیان کیا جاتا ہے :۔

ا۔ بڑی بوڑھیاں اپنے چھوٹے چھوٹے نواسوں اور پوتوں سے اس قسم کے واقعات بیان نہیں کرتیں۔

۲۔ زہرِ عشق جب سے شائع ہوئی مشہور ہے۔ حالی اور اُن کے بعد بہت سے ناقدوں نے اس پر مضامین لکھے لیکن ۱۹۲۸ء سے پہلے جب احسن لکھنوی بوڑھے ہو چکے تھے۔ انھوں نے کسی سے یہ روایت نہ بیان کی اور نہ کہیں اس کا ذکر کیا۔

۳۔ کوئلے سے پوری مثنوی کا دیوار پر لکھ ڈالنا عجیب سی بات ہے۔

ان وجوہ کی بنا پر ہم اس روایت کو بے بنیاد سمجھتے ہیں۔

بعض لوگوں میں مشہور رہے کہ زہرِ عشق کے چھپنے پر کچھ دنوں کے لیے حکومت کی طرف سے پابندی لگا دی گئی تھی۔ استاد محترم ڈاکٹر مسیح الزماں کا خیال ہے کہ یہ بات بھی صحیح نہیں۔

البتہ زہر عشق کا ڈراما آخر انیسویں صدی میں کسی تھیٹر کمپنی نے لکھنؤ میں اس کامیابی سے پیش کیا کہ ناظرین میں بہتوں کے ہچکیاں بندھ گئیں اور روتے روتے بیہوش ہو کر کوئی چل بسا۔ اسے بعض لوگوں نے خودکشی سے تعبیر کیا۔ ان حالات میں حکام نے زہر عشق کے ڈرامے کے کھیلے جانے کی ممانعت کر دی ۔ یہ حکم ۲۲ر جولائی ۱۹۱۹ء کو منسوخ ہوا۔

## کردار نگاری

زہر عشق کا قصہ بہت مختصر ہے اس لیے زیادہ کرداروں کی ضرورت نہیں پڑی۔ یہاں ہیرو، ہیروئن ان دونوں کی مائیں اور ایک کنیز کو پیش کیا گیا ہے۔ ہیرو کی ماں ایک جگہ اسے دل گرفتہ دیکھ کر چند سوالات کرتی ہے۔ ہیروئن کی ماں اس کی موت پر گریہ وزاری کرتی ہے۔ اس کی کیفیت کا نقشہ بہت صحیح ہے اسی لیے اس سے ہمدردی ہو جاتی ہے۔ کنیز پورے قصے میں صرف شروع میں ایک جگہ بولتی ہے۔

ہیرو کا کردار کوئی خاص نہیں ہے اس میں بعض ایسی خرابیاں ہیں کہ اس سے ہمیں کوئی ہمدردی نہیں ہوتی وہ شروع ہی سے دلگیر اور سست قسم کا انسان نظر آتا ہے اور اسی لیے وہ کوئی خاص عمل نہیں کرتا۔ ہر بات کی ابتدا ہیروئن کی طرف سے ہوتی ہے۔ شوق نے ہیرو کی حالتِ ہجر کا بیان تفصیل سے کیا ہے۔ وہ ہر وقت روتا رہتا ہے، بیمار نظر آتا ہے، اسے کوئی مشکل سے پہچان سکتا ہے لیکن ان تمام مایوسیوں کے باوجود وہ کوئی ایسا اقدام نہیں کرتا کہ اُسے اپنے مقصد میں کامیابی حاصل ہو۔ ہیروئن پہلا قدم اُٹھاتی ہے اور اُسے خط بھیجتی ہے۔ ہیرو جواب میں اپنی حالت زار لکھتا ہے پھر بھی ملنے کی کوئی صورت نہیں نکالتا۔ اس کی بے عملی کا سب سے بڑا ثبوت اس وقت ملتا ہے جب لڑکی دو ماہ تک اس کے گھر نہیں آتی اور وہ اس کے متعلق معلومات فراہم نہیں کرتا۔ اس وقت

بھی ہیروئن ملنے کی صورت نکالتی ہے اور ہیرو اشک باری کے سوا کسی چیز سے اپنی محبت کا ثبوت نہیں دیتا۔ آخری ملاقات میں جب ہیروئن خودکشی کا ارادہ ظاہر کرتی ہے تو اُس کی بے عملی ناقابل برداشت ہو جاتی ہے، وہ اُس کو خودکشی سے باز رکھنے کے لیے کوئی خاص قدم نہیں اُٹھاتا۔ صرف اُسے زبانی طور پر سمجھا بجھا کر رخصت کر دیتا ہے۔ لڑکی چلی جاتی ہے اور اس کے بعد ہی شور ماتم سُنائی دیتا ہے۔

ان تمام واقعات سے لوگوں کو یہ اندازہ ہوتا ہے کہ ہیرو واقعی اتنی شدت سے محبت نہیں کرتا جتنا کہ ہیروئن کرتی ہے۔ لیکن ایسا نہیں ہے۔ اگر ہم شروع سے قصّہ پر غور کریں تو صاف ظاہر ہوتا ہے کہ ہیروئن نے ایک غلط آدمی کا انتخاب کیا ہے جو مجہول اور سست قسم کا انسان ہے اس میں ہمت اور جوانمردی کی کمی ہے وہ بے عمل ہے اور اس میں محبت کی تڑپ اتنی شدید نہیں ہے جتنی جنسی قربت کی خواہش۔ محبت الگ جذبہ ہے اور بوالہوسی الگ۔ شروع میں جب ہیروئن اسے خط لکھ کر تعلقات کی ابتدا کرتی ہے تو وہ اس کے جواب میں:

اب جو بھیجی یہ آپ نے تحریر — ہے یہ لازم کہ وہ کرو تدبیر
سختیاں ہجر کی بدل جائیں — دل کی سب حسرتیں نکل جائیں

کسی سچے عاشق کے لیے صرف اتنی بات باعث فخر و مسرت ہو سکتی ہے کہ اُس کی محبوبہ اُسے نامۂ شوق بھیجتی ہے اور وہ اس کے جواب میں اپنی دلی خوشی کا اظہار کر سکتا ہے لیکن ایک ایسا عاشق جسے اختلاط کی دُھن ہو وہ فوراً ایسے موقعے تلاش کرتا ہے کہ محبوب کو بالکل قریب کر سکے۔ شوق کا ہیرو بڑی حد تک اپنے زمانے کا نمونہ ہے۔ اس زمانے کے امیرزادے کام کرنا اپنی توہین بھی سمجھتے تھے اور معاشرت میں کام نہ کرنا شائستگی کا معیار بن گیا تھا۔ وہ دوسروں کے سہارے زندہ رہتے تھے اور اپنی مشکلوں کا حل خود نکالنے کے بجائے غیبی طاقتوں کی مدد کی اُمید رکھتے تھے۔ اسی خصوصیت نے اس تہذیب کو زوال کا منہ دکھایا۔ سحرالبیان کا بے نظیر، اندرسبھا کا گلفام بھی اسی بے عملی کے نمونے ہیں۔

شوق نے ہیروئن کا کردار بڑی خوبی سے پیش کیا ہے۔ وہ اعلیٰ تصوریت کا نمونہ ہے اس کے خیالات میں استواری اور مضبوطی پائی جاتی ہے۔ اس میں محبت اور ایثار کا جذبہ کوٹ کوٹ کر بھرا ہے۔ وہ کم سن، حسین اور ذہین ہے۔ پہلو میں ایک دردآشنا دل رکھتی ہے جو محبت کرنا اور نباہنا جانتا ہے۔ ایک دن اپنے مکان کے بالائی حصے پر تفریح کی غرض سے جاتی ہے وہیں دوسرے مکان کے بالائی حصے پر ہیرو کو دیکھتی ہے۔ ایک طرح کی کشش اور تڑپ محسوس کرتی ہے اور پھر دل سے اتنا مجبور ہو جاتی ہے کہ خود اپنا حالِ دل لکھ کر بھیجتی ہے یہیں سے قصے کی ابتدا ہوتی ہے۔ نوجوان عاشق اس سے ملاقات کی خواہش ظاہر کرتا ہے وہ موقع نکالتی ہے۔ پھر دو محبت کرنے والے ملتے ہیں اُن کے ملنے سے شعلے بھڑکتے ہیں اور شرارے پھوٹتے ہیں۔ وہ شرارے جو دل میں روشنی بھی کرتے ہیں اور جلا کر خاکستر بھی کر دیتے ہیں۔ لڑکی کے والدین کو ان تعلقات کا پتہ چل جاتا ہے وہ اپنی کنواری لڑکی کی عزت آبرو بچانے کے لیے اسے گھر سے دور بھیجنے کا ارادہ کرتے ہیں۔ لڑکی کو اس کا علم ہو جاتا ہے لیکن محبت میں وہ ایسے مقام پر پہنچ چکی ہوتی ہے کہ اسے نہ یہ دوری گوارا ہو سکتی ہے نہ یہ توہین کہ سارے خاندان والے انگشت نمائی کریں اور مجرموں کی طرح اس سے سلوک کریں۔ وہ ایسے سماج کی فرد ہے جس میں عورت کے ساتھ رُسوائی کا دھبہ ہمیشہ کے لیے لگ جاتا ہے اور مرد کے لیے اسے صرف تفریح قرار دیا جاتا ہے خصوصاً اس وقت تو متعدد عورتوں سے مرد کے تعلقات ایک صفت سمجھے جاتے تھے۔ وہ آخری بار محبوب سے ملنے آتی ہے اُسے اپنی بدنصیبی کا حال سناتی ہے اور خودکشی کا خیال ظاہر کرتی ہے اس کے بعد رخصت ہو جاتی ہے اور زہر کھا کر اپنے ارادے کو عملی جامہ پہناتی ہے۔

وہ جاگیردارانہ سماج کی ایسی لڑکی کا نمونہ ہے جو نہ تو کسی کو چاہ سکتی ہے اور نہ ہی چاہے جانے کا حق رکھتی ہے۔ اس کی ساری زندگی لفظ "محبت" سے وابستہ ہے وہ اسی لیے زندہ ہے اور اسی کے لیے جان دے دیتی ہے۔ مجنوں گورکھپوری اس کے متعلق

لکھتے ہیں :-

"ایک کم سن لڑکی کی بساط ہی کیا مگر اللہ رے ہمت و استقلال۔ مرنے کا پورا نقشہ درست کر چکی ہے زندگی اس کے لیے بے اصل و بے معنی ہو چکی ہے۔ کل صبح نہ وہ ہوگی نہ اُس کی دُنیا۔ لیکن اس کے تیور جہاں تھے وہیں رہے۔ ماتھے پر ہراس و سراسیمگی کی کوئی علامت نہیں۔ نہ اُس کو دنیا کے چھوٹنے کا غم ہے نہ عقبیٰ کی بازپرس کا ڈر۔" [1]

اس کردار کی بلندی پر عطاء اللہ پالوی اپنی رائے کا اظہار اس طرح کرتے ہیں:

"زہرِ عشق کی ہیروئن نے انسان کی فطری اساس کے مطابق محبت کی اور پھر اس کو نبھانے کے لیے اپنی عزیز ترین متاعِ حیات بھی قربان کرنے سے دریغ نہ کی۔ یہی خصوصیت اسے فراموش نہ کرنے کے لیے کیا کم تھی کہ ظالم نے وصیت اور اس کی تمہید کا مزید ایک ایسا بے نظیر صحیفہ اپنی غیر فانی یادگار چھوڑا جس کا جواب ادبیاتِ عالم میں نہیں ملتا۔" [2]

پروفیسر خواجہ احمد فاروقی کا خیال ہے:

"وہ اپنے آہنی عزم کے ساتھ عاشق سے آخری بار ملنے جاتی ہے اور اسے تمام واقعات سے آگاہ کر دیتی ہے۔ یہ منظر نہایت دل دوز ہے اور اثر انگیزی کے لحاظ سے شاید ہی اس کی کوئی مثال اُردو لٹریچر میں مل سکے۔ یہ اس کی آخری ملاقات ہے اور زندگی کی آخری شب، صبح ہوتے ہی وہ اپنی روح کی امانت کو موت کے سپرد کر دیتی ہے اس وقت موت کی ہیبت ناک صورت اسے ڈراؤنی معلوم نہیں ہوتی ............ اور ان سب پر جو چیز غالب ہے وہ بے لوث و بے غرض جذبۂ محبت اور حمیت ہے اور حقیقت یہ ہے کہ اسی جذبے نے

---

[1] مجنوں گورکھپوری : زہرِ عشق۔ ص ۲۷
[2] عطاء اللہ پالوی: تذکرۂ شوق ص ۳۸۶

اس کے اوپر سے خودکشی کی برائی کو بڑی حد تک دور کر دیا ہے"۔ [1]

ان روایوں سے ظاہر ہوتا ہے کہ 'زہرِ عشق' کی ہیروئن کوئی فرشتہ نہیں۔ انسان ہے۔ جذبات کے جوش اور محبت کے وفور میں خط بھی لکھتی ہے، ملنے کے لیے بھی آتی ہے اور اپنی کم سنی، ناسمجھی اور ناتجربہ کاری کی وجہ سے اختلاط کی وہ تمام منزلیں طے کر لیتی ہے جو ایک کنواری لڑکی کے لیے معیوب ہیں۔ حالانکہ اسے اس کا بھی یقین نہیں ہے کہ اس کی شادی اسی نوجوان سے ہو گی یا کسی اور سے۔ آخری منظر میں مرنے کا فیصلہ بھی اس کی جلد بازی اور ناسمجھی ہے۔ بدنامی کے دھبے کو دھونے کے بہت سے طریقے ہیں لیکن اس کے سامنے سوا جان دینے کے اور کوئی صورت نہیں ہے۔ وہ کہیں بھی اپنے محبوب سے یہ نہیں کہتی کہ "ہم شادی کر کے ایک ہو جائیں۔ اس بدنامی سے بچ جائیں"۔ جیسے اپنی مرضی سے شادی کا تصور ہی اس معاشرت میں نہیں تھا۔ ماں باپ کی اکلوتی اولاد، لاڈ پیار میں پلا ہوا مزاج، محبت میں سرشار جوان حوصلے، ماں باپ کی سخت باتوں کو برداشت نہیں کر پاتے اور یہ اس کے مزاج کی تیزی اور فیصلے کی جلد بازی ہی ہے کہ وہ خودکشی کا ارادہ کرتی ہے اور کر ڈالتی ہے۔ آخری منظر میں جہاں ہیروئن کی زبانی موت اور زندگی کا فلسفہ بیان کیا گیا ہے اس سے مرزا شوق کا مقصد یہی ہے کہ معاشرت کی اصلاح کے لیے غلط اقدام کی ساری داستان کہنے کے بعد اس کا انجام بھی پیش کر دیا ہے کہ زندگی فانی ہے اور اسی زندگی کے لیے وقتی لذت اندوزی کے لیے انسان کیا کچھ نہیں کرتا لیکن سب پر حاوی ہے وہ ایک حقیقت جسے موت کہتے ہیں اور اس کے بعد کچھ باقی نہیں رہتا۔ اور اسی لیے شوق کی مثنویاں معاشرتی اصلاح کا ذریعہ بھی کہی جاتی ہیں۔

زہرِ عشق کے ایک کم قیمت اور معقول اڈیشن کی ضرورت مجھے سب سے پہلے اس وقت

---

[1] خواجہ احمد فاروقی: ذوق و جستجو ص ۱۸۸

محسوس ہوئی تھی جب میں ایم۔اے میں پڑھ رہی تھی۔ خوش قسمتی سے اب ایسی صورت نکل آئی ہے کہ میں اس کمی کو پورا کر رہی ہوں۔ اپنے استاد ڈاکٹر مسیح الزماں کے سامنے جب میں نے اس خیال کو رکھا تو انھوں نے میری ہمت افزائی کی اور ان کی چشمِ کرم کی بدولت میں نے یہ اڈیشن تیار کر لیا جس میں طلبہ کی ضرورتیں خاص طور پر مدِ نظر رکھی گئی ہیں۔ بھائی حامد ندیم کی بھی شکر گذار ہوں کہ انھوں نے زہرِ عشق کے اس اڈیشن کو منظرِ عام پر لانے کی زحمتیں اُٹھائیں +

۷ر جون ۱۹۷۲ء

عطیہ نشاط

## نواب مرزا شوق لکھنوی

# مثنوی

# زہرِ عشق

# زہرِ عشق

لکھ قلم پہلے حمد ربِ ودود ۔ کہ ہر اک جا پہ ہے وہی موجود
ذات معبود جاودانی ہے ۔ باقی جو کچھ کہ ہے وہ فانی ہے
ہمسر اُس کا نہیں ندیم نہیں ۔ سب ہیں حادث کوئی قدیم نہیں

---

مدحِ احمد زباں پہ کیوں کر آئے ۔ بحر کوزے میں کس طرح سے سمائے
ذاتِ احمدؐ کو کوئی کیا جانے ۔ یا علیؑ جانے یا خدا جانے

---

مدحِ حیدرؑ میں کھولیے جو دہن ۔ اس سے آگے نہیں ہے جائے سخن
کون حیدر کا مرتبہ سمجھا ۔ کوئی بندہ کوئی خدا سمجھا

---

ہے بنا جب سے گلشنِ ایجاد ۔ ہوئی ہر شے ہر ایک کو امداد
رنگِ خوبی عطا کیا گُل کو ۔ نالہ و درد بخشا بلبل کو
ماہ کو نور، ظلمت ہالے کو ۔ چشم نرگس کو، داغ لالے کو
راستی کی عطا صنوبر کو ۔ پیچ سنبل کو، آب گوہر کو
سختی ساری بتوں کے دل میں دی ۔ اُلفت انساں کے آب و گل میں دی
عشق سے کون ہے بشر خالی ۔ کر دیئے جس نے گھر کے گھر خالی
پڑتے ہیں اس میں جان کے لالے ۔ ڈالتا ہے جگر میں بھالے

جو کہ واقف تھے سب قرینوں سے — خاک چھنوائی اُن حسینوں سے
اِس سے اُمید رکھنا ہے بیجا — بھائی مجنوں سے کیا سلوک کیا
مُنھ سے کرنے نہ دی فغاں اُس نے — مارے چُن چُن کے نوجواں اُس نے
اس سے جس نے ذرا تپاک کیا — سب سے پہلے اُسے ہلاک کیا
آتشِ ہجر سے جلاتا ہے — آگ باقی میں یہ لگاتا ہے
مارڈالا تماش بینوں کو — زہر کھلوادیا حسینوں کو
بس میں ڈالے نہ کبریا اُس کے — رحم دل میں نہیں ذرا اس کے
ایک قصہ عجیب لکھتا ہوں — داستانِ غریب لکھتا ہوں
تازہ اِس طرح کی حکایت ہے — سُننے والوں کو جس سے حیرت ہے
جس محلے میں تھا ہمارا گھر — وہیں رہتا تھا ایک سوداگر
مرد اشراف صاحبِ دولت — تاجروں میں کمال ذی عزت
غم نہ تھا کچھ فراغ بالی سے — تھا بہت خاندان عالی سے
ایک دختر تھی اُس کی ماہ جبیں — شادی اُس کی نہیں ہوئی تھی کہیں
ثانی رکھتی نہ تھی وہ صورت میں — غیرتِ حور تھی حقیقت میں
سبزۂ نخلِ گُل جوانی تھا — حُسنِ یوسف فقط کہانی تھا
اس سن و سال پر کمالِ خلیق — چال ڈھال انتہا کی نستعلیق
چشمِ بددور وہ حسیں آنکھیں — رشکِ چشمِ غزال چیں آنکھیں
تھا جو ماں باپ کو نظر کا ڈر — آنکھ بھر کر نہ دیکھتے تھے اُدھر
تھی زمانے میں بے عدیل و نظیر — خوش گلو۔ خوش جمال۔ خوش تقریر
تھا نہ اس شہر میں جواب اُس کا — حُسن لاکھوں میں انتخاب اُس کا
شعر گوئی سے ذوق رہتا تھا — لکھنے پڑھنے کا شوق رہتا تھا

رُخ پہ گیسو کی لہر آفت تھی
جو ادا اُس کی تھی قیامت تھی
تھا یہ اُس گُل کا جامہ زیب بدن
سادی پوشاک میں تھے سَو جوبن
سارا گھر اُس پہ رہتا تھا قرباں
روحِ گھر ماں کی تھی تو باپ کی جاں
نورِ آنکھوں کا دل کا چین تھی وہ
راحتِ جانِ والدین تھی وہ

---

ایک دن چرخ پر جو ابر آیا
کچھ اندھیرا سا ہر طرف چھایا
کھُل گیا جب برس کے وہ بادل
قوس تب آسماں پہ آئی نکل
دل مرا بیٹھے بیٹھے گھبرایا
سیر کرنے کو بام پر آیا
خفقانِ دل کا جو بہلنے لگا
اِس طرف اُس طرف ٹہلنے لگا
دیکھا اک سمت جو اُٹھا کے نظر
سامنے تھی وہ دُخترِ سوداگر
ساتھ ہمجولیاں بھی تھیں دو چار
دیکھتی تھیں وہ آسماں کی بہار
بام سے کچھ اُترتی جاتی تھیں
چُہلیں آپس میں کرتی جاتی تھیں
رہ گئی جب اکیلی وہ گُل رو
نگراں سیر کی ہوئی ہر سو
ہوئی میری جو اُس کی چار نگاہ
مُنھ سے بے ساختہ نکل گئی آہ
حالِ دل کا کہا نہیں جاتا
خوب سنبھلا نہیں غش آجاتا
نہ ہوا گو کلام حرفِ مابین
روح قالب میں ہو گئی بے چین
تیرِ اُلفت جو تھا لگا کاری
اشک بے ساختہ ہوئے جاری
سامنے وہ کھڑی تھی ماہِ منیر
چُپ کھڑا تھا میں صورتِ تصویر
تابِ نظارہ اتنی لا نہ سکا
کہ اشارے سے بھی بُلا نہ سکا
دیکھتا اس کو بار بار تھا میں
محوِ حُسنِ جمالِ یار تھا میں
گو میں رو کے ہوئے ہزار رہا
دل پہ لیکن نہ اختیار رہا

اسی صورت سے ہو گئی جب شام　　لائی پاس اُس کے اِک کنیز پیام
بیٹھی ناحق ہیں ہو لیں کھاتی ہیں　　امّاں جان آپ کو بُلاتی ہیں
گیسو رُخ پر ہوا سے ہلتے ہیں　　چلیے اب دونوں وقت ملتے ہیں
سُن کے لونڈی کے مُنھ سے یہ پیغام　　گئی کوٹھے کے نیچے وہ گلفام
اس کا جلوہ نہ جب نظر آیا　　میں بھی روتا ہوا اُتر آیا
شام سے پھر سحر کی مَر مَر کے　　شب وہ کاٹی خدا خدا کر کے
پڑ گیا دل میں غم سے اک ناسور　　یہی اس دن سے پڑ گیا دستور
دن میں سَو بار بام پر جانا　　دیکھنا بھالنا چلے آنا
جب نہ دیکھا وہاں پہ وہ گل رو　　فرطِ غم سے نکل پڑے آنسو
لاکھ چاہا نہ ہو سکا دل سخت　　پے بہ اشکیں رہی یہ آمد و رفت
گزرے کچھ دن تو رنج کے مارے　　زرد رُخسار ہو گئے سارے
ہو گئی پھر تو ایسی حالتِ زار　　جیسے برسوں کا ہو کوئی بیمار
دل کو تھی غم سے خود فراموشی　　لگ گئی لب پہ مُہرِ خاموشی
نہ رہا دل کو ضبط کا یارا　　سر جہاں چاہا دھڑ سے دے مارا
رنج لاکھوں طرح کے سہتے تھے　　لب پہ خاموش اشک بہتے تھے
ہجر سے غیر ہو گئی حالت　　غم سے بالکل بدل گئی صورت
ہوا حیران اپنا بیگانا　　جس نے دیکھا مجھے نہ پہچانا
دیکھے ماں باپ نے جو یہ انداز　　روح قالب سے کر گئی پرواز

---

پوچھا مجھ سے یہ کیا ہے حال ترا　　کس طرف ہے بندھا خیال ترا
سچ بتا دے کہ دھیان کس کا ہے　　دل میں غم میری جان کس کا ہے

رنج کس شعلہ رو کا کھاتے ہو
شمع کی طرح پگھلے جاتے ہو

زرد چہرہ ہے ارغواں کی طرح
ٹکڑے پوشاک ہے کتاں کی طرح

کون سی ماہ رو پہ مرتے ہو
سچ کہو کس کو پیار کرتے ہو

یہ کہو مہ جبیں ملا ہے کون؟
تم کو ایسا حسیں ملا ہے کون؟

کھاتے ہو، پیتے ہو، نہ سوتے ہو
روز اُٹھ اُٹھ کے شب کو روتے ہو

نہیں معلوم کون ہے وہ چھنال
کر دیا میرے لال کا یہ حال

میرے بچے کی جو کڑھائے جان
سات بار اُس کو میں کروں قربان

اللہ آمیں سے ہم تو یوں پالیں
آپ آفت میں جاں کو یوں ڈالیں

تیرے پیچھے کی تلخ سب اوقات
دن کو دن سمجھی اور نہ رات کو رات

پالا کس کس طرح تمھیں جانی
کون منت تھی جو نہیں مانی

روشنی مسجدوں میں کرتی تھی
جا کے درگاہ چوکی بھرتی تھی

اب جو نامِ خدا جواں ہوئے
ایسے مختار میری جان ہوئے

ہاں میاں سچ ہے یہ خدا کی شان
تم کرو جان بوجھ کر ہلکان

ہم تو یوں پھونک پھونک رکھیں قدم
آپ دیتے پھریں ہر ایک پہ دم

ہم یہاں رنج و غم میں روتے ہیں
آپ غیروں پہ جان کھوتے ہیں

یوں مٹاؤ گے جان کر ہم کو
تھی نہ اس روز کی خبر ہم کو

دیکھتی ہوں جو تیرا حال زبوں
خشک ہوتا ہے میرے جسم کا خوں

یوں تو برباد تو شباب نہ کر
مٹی ماں باپ کی خراب نہ کر

کچھ تو کہہ ہم سے اپنے قلب کا حال
کس کا بھایا ہے تجھ کو حسن و جمال

دل ہوا تیرا شیفتہ کس کا
سچ بتا ہے فریفتہ کس کا

کیسا دو دن میں جی نڈھال ہوا
دائی بندی کا کیا یہ حال ہوا

آئینہ تو اُٹھا کے دیکھ ذرا ۔۔۔ سُت گیا دو ہی دن میں مُنھ کیسا
سُدھ نہ کھانے کی ہے نہ پینے کی ۔۔۔ کون سی پھر اُمید جینے کی
کس کی اُلفت میں ہے یہ حال کیا ۔۔۔ کچھ نہ ماں باپ کا خیال کیا
دل پہ گذرا ہے کیا ملال تو کہہ ۔۔۔ مُنھ سے نا شدنی اپنا حال تو کہہ
یوں ہی گمرہ ہو گیا تو سودائی ۔۔۔ دور پہونچ گی اِس کی رُسوائی
ایسے دیوانے کو بھرے گا کون؟ ۔۔۔ شادی اور بیاہ پھر کرے گا کون
کر دیا کس نے ایسا آوارہ ۔۔۔ کہ نہیں بنتا اب کوئی چارہ
آگے تو یہ نہ تھا ترا دستور ۔۔۔ کس سے سیکھے ہیں اس طرح کے اُمور
میرے تو دیکھ کے گئے اوسان ۔۔۔ لیلیٰ مجنوں کے تو نے کاٹے کان
باتیں یہ والدین کی سُن کر ۔۔۔ اور اک قلب پر لگا نشتر
شرم کے مارے منھ کو ڈھانپ لیا ۔۔۔ کچھ نہ ماں باپ کو جواب دیا
گزرا یاں تک تو یہ ہمارا حال ۔۔۔ اب بیاں اُن کا ہوتا ہے احوال
میں تو کھائے ہوئے تھا عشق کا تیر ۔۔۔ پر ہوئی اُن کے دل پہ بھی تاثیر
چھلکے آنکھوں کے دونوں پیمانے ۔۔۔ دل لگا آپ ہی آپ گھبرانے
آتشِ عشق سے جو اُٹھا دھواں ۔۔۔ باتوں باتوں میں بڑھ گیا خفقاں
گوشِ فریاد قلب سُننے لگے ۔۔۔ خود بخود ہاتھ پاؤں دُھننے لگے
درد و غم دل کو آگیا جو پسند ۔۔۔ سونا راتوں کا ہو گیا سوگند
موجِ اُلفت اُسے ڈبونے لگی ۔۔۔ ایک اُلجھن سی دل کو ہونے لگی
گھٹنے طاقت لگی جو روز بروز ۔۔۔ آتشِ ہجر ہو گئی دل سوز
داغ جوں جوں جگر کے جلتے تھے ۔۔۔ اشک گرم آنکھ سے نکلتے تھے
گرم نالے تھے دل پہ آہ تھی سرد ۔۔۔ دل میں ہوتا تھا میٹھا میٹھا درد

یوں تڑپتا تھا اس کے سینے میں دل — جس طرح لوٹے طائرِ بسمل
ہو گئی جب کمال حالتِ زار — شب کو رہنے لگا اُسے بھی بخار
سچ ہے کس طرح جی اُداس نہ ہو — کوئی ہمراز بھی جو پاس نہ ہو
نہ رُکا اُس کے روکے سے دلِ زار — جی میں باقی رہا نہ صبر و قرار

---

لکھنے پڑھنے کا تھا جو اُس کو ذوق — سوچ کر دل میں لکھا اک خطِ شوق
بھیجا مجھ کو وہ بے خطر نامہ — ڈر سے لکھا مگر نہ سرنامہ
ایک ماما نے آکے چپکے سے — خط دیا اُس کا ہاتھ میں میرے
کھول کر میں نے جو اُسے دیکھا — کچھ عجیب درد سے یہ لکھا تھا
ہو یہ معلوم تم کو بعد سلام — غمِ فرقت سے دل ہے بے آرام
اپنے کوٹھے پہ تو نہیں آتا — دل ہمارا بہت ہے گھبراتا
شکل دکھلا دے کبریا کے لیے — بام پر آ ذرا خدا کے لیے
اِس محبت پہ ہو خدا کی مار — جس نے یوں کر دیا مجھے ناچار
سارے اُلفت نے کھو دیے اوسان — ورنہ یہ لکھتی میں خدا کی شان
اب کوئی اِس میں کیا دلیل کرے — جس کو چاہے خدا ذلیل کرے

---

پڑھ کے میں نے لکھا یہ اُس کو جواب — کیا لکھوں تم کو اپنا حالِ خراب
بن گئی یاں تو جان پہ میری — خوب لی آپ نے خبر میری
ہجر میں مر کے زندگانی کی — اب بھی پوچھا تو مہربانی کی
جب سے دیکھا ہے آپ کا دیدار — دل سے جاتا رہا ہے صبر و قرار
روز تپ سے بخار رہتا ہے — سر پہ اک جن سوار رہتا ہے

تیرے قدموں کی ہوں قسم کھاتا
ہوش دو دو پہر نہیں آتا

پوچھتا ہے جو کوئی آکر حال
اور ہوتا ہے میرے دل کو ملال

کہوں کس کس سے اس کہانی کو
آگ لگ جائے اِس جوانی کو

ہو گئی ہے کچھ ایسی طاقت طاق
اُٹھ نہیں سکتا بارِ رنجِ فراق

ہل کے پانی پیا نہیں جاتا
ورنہ حکم آپ کا بجا لاتا

پاتا طاقت جو طالبِ دیدار
بام پر آتا دن میں سو سو بار

پہونچا جس وقت سے ترا مکتوب
زندگی کا بندھا ہے کچھ اسلوب

رنج راحت سے گر بدل جائے
کیا عجیب ہے جو دل سنبھل جائے

پیش قدمی جو تم نے کی مرے ساتھ
اس میں ذلت کی کون سی ہے بات

نہیں کچھ اس میں آپ کا ہے قصور
میری اُلفت کا یہ اثر ہے حضور

عشق کا ہے اثر مرے واللہ
ورنہ تم لکھتیں یہ معاذ اللہ

تم تو وہ لوگ ہوتے ہو جلاد
نہیں سُنتے کوئی کرے فریاد

ہو بلا سے کسی کا حال بُرا
کوئی مر جاوے تم کو کیا پروا

نہیں ممکن تمھارا بل جائے
دم بھی عاشق کا گر نکل جائے

اب میں لکھتا ہوں آپ کو یہ حضور
وصل کی فکر چاہیے ہے ضرور

اس میں غفلت جو تو نے کی اے ماہ
حال ہوگا میرا کمال تباہ

غیر ہے ہجر سے مری حالت.
غم اُٹھانے کی اب نہیں طاقت

دل پہ آفت عجیب آئی ہے
جان بچ جائے تو خدائی ہے

جان کو کس گھڑی قرار آیا
غش نے فرصت جو دی بخار آیا

تپشِ دل نے گر کیا ہشیار
وہم آنے لگے ہزار ہزار

دل کی وحشت نے کچھ جو مارا جوش
وہ بھی جاتے رہے جو آئے تھے ہوش

آشنا دوست آگئے جو کبھو | جس نے دیکھا نکل پڑے آنسو
جھوٹ سمجھیں اسے حضور نہیں | جان جاتی رہے تو دور نہیں
مر گئے ہم تو رنجِ فرقت سے | پر خبر کی نہ اپنی حالت سے
اب جو بھیجی یہ آپ نے تحریر | ہے یہ لازم کہ وہ کرو تدبیر
سختیاں ہجر کی بدل جائیں | دل کی سب حسرتیں نکل جائیں
دے کے خط میں نے یہ کہا اُس سے | جلد اس کا جواب لا اس سے
پہونچا جب اُس تلک مرا مکتوب | ہنس کے بولی کہ واہ وا کیا خوب

---

پھر کیا یہ جواب میں تحریر | کچھ قضا تو نہیں ہے دامن گیر
ذکر ان باتوں کا یہاں کیا تھا | چھیڑنے کو ترے یہ لکھا تھا
ایسی باتیں تھیں کب یہاں منظور | تھا فقط تیرا امتحاں منظور
یہ تو لکھے تھے سب ہنسی کے کلام | ورنہ اِن باتوں سے مجھے کیا کام
مجھ کو ایسی تھی کیا تری پروا | بام پر تو بلا سے آکر نہ آ
بات تھی یہ کمال عقل سے دور | جھوٹ لکھنے پہ ہوگئے مغرور
تم پہ میں مرتی کیا قیامت تھی | کیا مرے دشمنوں کی شامت تھی
میری جانب سے یہ گماں کیا خوب | جھوٹ جم جم سے ہے بہت مرغوب
یہ نہ سمجھا کہ ماجرا کیا ہے؟ | یوں بھی کوئی کسی کو لکھتا ہے
کالا دانہ ذرا اُتروا لو | رائی لون اس سمجھ پہ کرڈالو
تجھ پہ مرتے بھی گر مرے بدخواہ | یوں نہ لکھتی کبھی معاذاللہ
جان پاپوش سے نکل جاتی | پر طبیعت نہ یوں بدل جاتی
ایسی باتوں میں ہوتا ہے بدنام | پھر نہ لکھے گا اس طرح کے کلام

رنج آجاتا ہے اسی کد سے
نہ بڑھے آدمی کسی حد سے

کیا سمجھ کر لکھا تھا یہ مضموں
اچھی ہوتی نہیں ہے اتنی ددوں

جی میں ٹھانی ہے کیا بتاؤ تو؟
خانگی کسبی کوئی سمجھے ہو؟

مال زادی نہیں یہاں کوئی
جو کرے تم سے گرمیاں کوئی

دیکھ تحریر فیل لائے آپ
خوب جلدی مزے میں آئے آپ

طالبِ وصل جو ہوئے ہم سے
ہے گا سادہ مزاج جم جم سے

---

رہی کچھ روز تو یہی تحریر
پھر موافق ہوئی مری تقدیر

ہوئے اُس گل سے وصل کے اقرار
اُٹھ گئی درمیاں سے سب تکرار

جو کہا تھا ادا کیا اُس نے
وعدہ اک دن وفا کیا اُس نے

رات بھر میرے گھر میں رہ کے گئی
صبح کے وقت پھر یہ کہہ کے گئی

بات اس دم کی یاد رکھیے گا
ایک دن یہ مزا بھی چکھیے گا

بگڑے گی جب نہ کچھ بن آئے گی
آپ کے پیچھے جان جائے گی

لو مری جان جاتی ہوں اب تو
یاد رکھیے گا میری صحبت کو

جو خدا پھر ملائے گا تم سے
تو کہوں گی میں حال آ تم سے

سُن کے میں نے دیا یہ اس کو جواب
نہ کرو دل کو اس قدر بیتاب

کہتی تم کیا ہو یہ خدا نہ کرے
یہ ستم ہووے کبریا نہ کرے

عمر بھر ہم وفا نہ توڑیں گے
زندگی بھر نہ مُنہ کو موڑیں گے

پیار کرتی جو تھی وہ غیرتِ حور
رکھا ملنے کا اُس نے یہ دستور

پنجشنبہ کو جاتی تھی درگاہ
واں سے آتی تھی میرے گھر وہ ماہ

عیش ہونے لگے مرے اُن کے
غیر جلنے لگے یہ سُن سُن کے

اتفاق ایسا پھر ہوا ناگاہ — دو مہینے تلک نہ آئی وہ ماہ
قطع سب ہو گئے پیام و سلام — نہ رہی شکل راحت و آرام
طبع کو ہو گئی پریشانی — عقل کو تھی عجب حیرانی
دل کو تشویش تھی یہ حد سے زیاد — دفعتاً پڑ گئی یہ کیا افتاد
تھی نہ مجھ سے یہاں کسی سے لاگ — کس نے اس طرح کی لگائی آگ
دل میں اس کے یہ کس نے بل ڈالا — جو مرے عیش میں خلل ڈالا
کچھ تو ایسا ہوا ہے افسانا — جو یہاں تک نہ ہو سکا آنا
نہیں معلوم کیا پڑی افتاد — جو فراموش کی ہماری یاد
کون ایسا ہے جائے گھر اس کے — کس کو بھیجوں مکان پر اس کے
کیوں نہ بیزار ہوں میں جینے سے — نہیں دیکھا ہے دو مہینے سے
جان آنکھوں میں کھنچ کے آئی ہے — اب نہیں طاقتِ جدائی ہے
کر لیا ہو سکا جہاں تک صبر — اب کہو دل کرے کہاں تک صبر
دو مہینے نہ دیکھے جب گل کو — چین کس طرح آئے بلبل کو
رات پھر کس طرح گذاری جائے — کس طرح دل کی بے قراری جائے
طبع کس طرح پھر بہل جائے — جسم سے روح جب نکل جائے
آئی نوچندی اتنے میں ناگاہ — اِس بہانے سے آئی وہ درگاہ
بس کہ مرتی تھی نام پر میرے — چھپ کے آئی وہاں سے گھر میرے
تھی نہ فرصت جو اشک باری سے — اُتری روتی ہوئی سواری سے
پھر لپٹ کر مرے گلے اک بار — حال کہنے لگی وہ یوں اظہار

---

اقربا میرے ہو گئے آگاہ — تم سے ملنے کی اب نہیں کوئی راہ
مشورے یہ ہوئے ہیں آپس میں — بھیجتے ہیں مجھے بنارس میں

وہ چھٹے ہم سے جس کو پیار کریں
جبر کیوں کر یہ اختیار کریں

گو ٹھکانے نہیں ہیں ہوش و حواس
پر یہ کہنے کو آئی ہوں ترے پاس

جائے عبرت سرائے فانی ہے
موردِ مرگِ ناگہانی ہے

اونچے اونچے مکان تھے جن کے
آج وہ تنگ گور میں ہیں پڑے

کل جہاں پر شگوفہ و گل تھے
آج دیکھا تو خار بالکل تھے

جس چمن میں تھا بلبلوں کا ہجوم
آج اُس جا ہے آشیانۂ بوم

بات کل کی ہے نوجواں تھے جو
صاحبِ نوبت و نشاں تھے جو

آج خود ہیں نہ ہے مکاں باقی
نام کو بھی نہیں نشاں باقی

غیرتِ حور مہ جبیں نہ رہے
ہیں مکاں گر تو وہ مکیں نہ رہے

جو کہ تھے بادشاہ ہفت اقلیم
ہوئے جا جا کے زیر خاک مقیم

کوئی لیتا نہیں اب اُس کا نام
کون سی گور میں گیا بہرام

اب نہ رستم نہ سام باقی ہے
اک فقط نام ہی نام باقی ہے

کل جو رکھتے تھے اپنے فرق پہ تاج
آج ہیں فاتحہ کو وہ محتاج

تھے جو خود سر جہان میں مشہور
خاک میں مل گیا سب اُن کا غرور

عطر مٹی کا جو نہ ملتے تھے
نہ کبھی دھوپ میں نکلتے تھے

گردشِ چرخ سے ہلاک ہوئے
استخواں تک بھی ان کے خاک ہوئے

تھے جو مشہور قیصر و فغفور
باقی ان کے نہیں نشانِ قبور

تاج میں جن کے ٹکتے تھے گوہر
ٹھوکریں کھاتے ہیں وہ کاسۂ سر

رشکِ یوسف جو تھے جہاں میں حسیں
کھا گئے اُن کو آسمان و زمیں

ہر گھڑی منقلب زمانہ ہے
یہی دنیا کا کارخانہ ہے

ہے نہ شیریں نہ کوہ کن کا پتہ
نہ کسی جا ہے نل دمن کا پتہ

بوئے اُلفت تمام پھیلی ہے | باقی اب قیس ہے نہ لیلی ہے
صبح کو طائران خوش الحان | پڑھتے ہیں کُلُّ مَنْ عَلَیْھَا فَانْ
موت سے کس کو رستگاری ہے | آج وہ کل ہماری باری ہے
زندگی بے ثبات ہے اس میں | موت عینِ حیات ہے اِس میں
ہم بھی گر جان دے دیں کھا کر سم | تم نہ رونا ہمارے سر کی قسم
دل کو ہمجولیوں میں بہلانا | یا مری قبر پر چلے آنا
جا کے رہنا نہ اس مکان سے دُور | ہم جو مر جائیں تیری جان سے دُور
روح بھٹکے گی گر نہ پائے گی | ڈھونڈھنے کس طرف کو جائے گی
روکے رہنا بہت طبیعت کو | یاد رکھنا مری وصیت کو
ضبط کرنا اگر ملال رہے | میری رُسوائی کا خیال رہے
میرے مرنے کی جب خبر پانا | یوں نہ دوڑے ہوئے چلے آنا
جمع ہو لیں سب اقربا جس دم | رکھنا اس وقت تم وہاں پہ قدم
کہے دیتی ہوں جی نہ کھونا تم | ساتھ تابوت کے نہ رونا تم
ہو گئے تم اگرچہ سودائی | دور پہنچے گی اس کی رُسوائی
لاکھ تم کچھ کہو نہ مانیں گے | لوگ عاشق ہمارا جانیں گے
طعنہ زن ہوں گے سب غریب امیر | قبر پر بیٹھنا نہ ہو کے فقیر
سامنا ہو ہزار آفت کا | پاس رکھنا ہماری عزت کا
جب جنازہ مرا عزیز اُٹھائیں | آپ بیٹھے وہاں نہ اشک بہائیں
میری میت پہ دھیان رکھیے گا | بند اپنی زبان رکھیے گا
تذکرہ کچھ نہ کیجیے گا مرا | نام منہ سے نہ لیجیے گا مرا
اشک آنکھوں سے مت بہایئے گا | ساتھ غیروں کی طرح جائیے گا

آپ کا ندھا نہ دیجیئے گا مجھے
سب میں رُسوا نہ کیجیئے گا مجھے

رنگ دل کے بدل نہ جائیں کہیں
مُنھ سے نالے نکل نہ جائیں کہیں

ساتھ چلنا نہ سر کے بال کھُلے
تا کسی شخص پر نہ حال کھُلے

ہوتے آتش کے ہیں یہ پرکالے
تاڑ جاتے ہیں تاڑنے والے

ہو بیاں گر کسی جگہ مرا حال
تم نہ کرنا کچھ اس طرف کو خیال

ذکر سُن کر مرا نہ رو دینا
میری عزّت نہ یوں ڈبو دینا

رنجِ فرقت مرا اُٹھا لینا
جی کسی اور جا لگا لینا

ہو گا کچھ میری یاد سے نہ حصول
دل کو کر لینا اور سے مشغول

رنج کرنا نہ میرا میں قرباں
سُن لو گر اپنی جان ہے تو جہاں

دے نہ اُس کو خدا کبھی کوئی درد
ہوتا نازک کمال ہے دلِ مرد

دل میں کُڑھنا نہ مجھ سے چھوٹ کے تو
جان دینا نہ گھوٹ گھوٹ کے تو

آکے رو لینا میری قبر کے پاس
تا نکل جائے تیرے دل کی بھڑاس

آنسو چپکے سے دو بہا لینا
قبر میری گلے لگا لینا

اگر آ جائے کچھ طبیعت پر
پڑھنا قرآن میری تربت پر

غنچۂ دل مرا کھِلا جاتا
پھول تربت پہ دو چڑھا جاتا

رو کے کرنا نہ اپنا حال زبوں
تا نہ ہو جائے دشمنوں کو جنوں

دیکھیے کس طرح پڑے گی کل
سخت ہوتی ہے منزلِ اوّل

میرے مرقد پہ روز آنا تم
فاتحہ سے نہ ہاتھ اٹھانا تم

ہے یہ حاصل سب اتنی باتوں سے
مٹی دینا تم اپنے ہاتھوں سے

عمر بھر کون کس کو روتا ہے
کون صاحب کسی کا ہوتا ہے

کبھی آ جائے گر ہمارا دھیان
جانتا ہم پہ ہو گئی قرباں

دل میں کچھ آنے دیجیو نہ ملال
خواب دیکھا تھا سمجھیو یہ خیال

رنج و راحت جہاں میں توام ہے
کبھی شادی ہے اور کبھی غم ہے

ہے کسی جا پہ جشن شام و پگاہ
ہے کسی جا صدائے نالہ و آہ

مرگ کا کس کو انتظار نہیں
زندگی کا کچھ اعتبار نہیں

پھر ملاقات دیکھیں ہو کہ نہ ہو
آج دل کھول کے گلے مل لو

خوب سا آج دیکھ بھال لو تم
دل کی سب حسرتیں نکال لو تم

آؤ اچھی طرح سے کرلو پیار
کہ نکل جائے کچھ تو دل کا بخار

دل میں باقی رہے نہ کچھ ارماں
خوب مل لو گلے سے میں قرباں

حشر تک ہوگی پھر یہ بات کہاں
ہم کہاں تم کہاں یہ رات کہاں

کہہ لو سن لو جو کچھ کہ جی میں آئے
پھر خدا جانے کیا نصیب دکھائے

دل کو اپنے کرو ملول نہیں
رونے دھونے سے کچھ حصول نہیں

ہم کو گاڑے جو اپنے دل کو کڑھائے
ہم کو ہے ہے کرے جو اشک بہائے

عمر تم کو تو ہے ابھی کھینا
دن بہت سے پڑے ہیں رو لینا

باہیں دونوں گلے میں ڈال لو آج
جو جو ارمان ہوں نکال لو آج

پھر خدا جانے کیا مشیّت ہے
اتنی صحبت بہت غنیمت ہے

کل کسے بیٹھ کر کرو گے پیار
کس کی لو گے بلائیں تم ہر بار

کل گلے سے کسے لگاؤ گے
یوں کسے گود میں بٹھاؤ گے

حال کس کا سنائے گی آ کر
کس کی ماما بلائے گی آ کر

ہم تو اٹھتے ہیں اس مکاں سے کل
اب تو جاتے ہیں اس جہاں سے کل

یاد اتنی تمھیں دلاتے جائیں
پان کل کے لیے لگاتے جائیں

ہو چکا آج جو کہ کھانا ہونا
کل بسائیں گے قبر کا کونا

خاک میں ملتی ہے یہ صورتِ عیش
پھر کہاں ہم کہاں یہ صورتِ عیش

دیکھ لو آج ہم کو جی بھر کے
کوئی آتا نہیں ہے پھر مر کے

ختم ہوتی ہے زندگانی آج
خاک میں ملتی ہے جوانی آج

چپ رہو کیوں عبث میں روتے ہو
مفت کاہے کو جان کھوتے ہو

سمجھو اس شب کو شب برات کی رات
ہم ہیں مہماں تمھارے رات کی رات

چین دل کو نہ آئے گا تجھ بن
اب کے بچھڑے ملیں گے حشر کے دن

اب تم اتنی دعا کرو مری جان
کل کی مشکل خدا کرے آسان

پھل اٹھایا نہ زندگانی کا
نہ ملا کچھ مزا جوانی کا

دل میں لے کر تمھاری یاد چلے
باغِ عالم سے نامراد چلے

کہتی ہے بار بار ہمتِ عشق
ہے یہی مقتضائے غیرتِ عشق

چارپائی پہ کون پڑ کے مرے
کون یوں ایڑیاں رگڑ کے مرے

عشق کا نام کیوں ڈبو جائیں
آج ہی جان کیوں نہ کھو جائیں

جب تلک چرخِ بے مدار رہے
یہ فسانہ بھی یادگار رہے

بولی گھبرا کے پھر ٹھہر مری جاں
کچھ سنا بھی کہ کیا بجا اس آں

حسرتِ دل نگوڑی باقی ہے
اور یہاں رات تھوڑی باقی ہے

گود میں اپنی پھر بٹھالو جان
پھر گلے سے ہمیں لگا لو جان

ڈال لو پھر گلے میں باہوں کو
پھر گلوری چبا کے منہ میں دو

پھر کہاں ہم کہاں یہ صحبتِ یار
کر لو پھر ہم کو بھینچ بھینچ کے پیار

پھر مرے سر پہ رکھ دو سر اپنا
گال پھر رکھ دو گال پر اپنا

پھر اسی طرح منہ کو منہ سے ملو
پھر وہی باتیں پیار کی کر لو

لہر پھر یہ چڑھ رہی ہے کانوں کی
بو سنگھا دو تم اپنے بالوں کی

پھر ہم اُٹھنے لگیں بٹھا لو تم — پھر بگڑ جائیں ہم منا لو تم
پھر لبوں کو چبا کے بات کرو — پھر ذرا مسکرا کے بات کرو
پھر بلائیں تمھاری یار لیں ہم — آؤ پھر سر سے سر اُتار لیں ہم
رو نہ اس طرح سے تو زار و قطار — دشمنوں کو کہیں چڑھے نہ بخار
آپ اچھے بھلے بچھڑ جائیں — اور لینے کے دینے پڑ جائیں
کاٹ لے کوئی دھڑ سے سر میرا — بال بیکا نہ ہو مگر تیرا
میں دل و جاں سے ہوں فدا تیری — لے کے مر جاؤں میں بلا تیری
اب تو کیوں ٹھنڈی سانسیں بھرتا ہے؟ — کیوں مرے دل کے ٹکڑے کرتا ہے؟
میں ابھی تو نہیں گئی ہوں مر — کیوں سُجائی ہیں آنکھیں رو رو کر
اِس قدر ہو رہا ہے کیوں غمگیں — کیوں مٹاتا ہے اپنی جان حزیں
کر نہ رو رو کے اپنا حال زبوں — ارے ظالم ابھی تو جیتی ہوں
اشک بہتے ہیں ناگوار ترے — تو نہ رو ہو گئی نثار ترے
ایسے قصے ہزار ہوتے ہیں — یوں کہیں مردوے بھی روتے ہیں
یوں تو آنسو نہ تو بہا اپنے — دل کو مضبوط رکھ ذرا اپنے
رنج سے میرے کچھ اُداس نہ ہو — یوں تو للہ بدحواس نہ ہو
تم تو اتنے میں ہو گئے رنجور — تھک گئے اور ابھی ہے منزل دور
اسی غم نے تو مجھ کو مارا ہے — صدمہ تیرا نہیں گوارا ہے
اپنے مرنے کا کچھ نہیں ہے الم — دل میں میرے فقط ہے اس کا غم
جان ہم نے تو اس طرح کھوئی — کون تیری کرے گا دل جوئی
آکے سمجھائے گا۔ بہلائے گا کون — اس طرح سے گلے لگائے گا کون
کون روکے گا اس طبیعت کو — کس سے کہہ جاؤں اس وصیت کو

گو کہ بیجا ترا ہراس نہیں
کوئی دل سوز بھی تو پاس نہیں

میں کہاں ہوں جو ساتھ دوں تیرا
ہاتھ میں کس کے ہاتھ دوں تیرا

یوں تسلّی تری کرے گا کون
میری صورت بھلا مرے گا کون

کون یوں خوش کرے گا دل تیرا
دل ہے اس غم سے مضمحل میرا

جی لگے گا نہ ساتھ میں اس کا
دل لیے رہتا ہاتھ میں اس کا

پر میں اب اس کو کیا کروں کم بخت
آسماں دور ہے زمیں ہے سخت

گو کہ عقبیٰ میں روسیاہ چلی
مگر اپنی سی میں نباہ چلی

جی کو تم پر فدا کیا میں نے
حق وفا کا ادا کیا میں نے

بولی پھر زانوؤں پہ مار کے ہاتھ
نہیں معلوم اب ہے کتنی رات

جوں جوں گھڑیال داں بجاتا تھا
جی مرا سنسنایا جاتا تھا

یوں تو کوئی نہ درد و غم میں گھرے
بھولے جاتے ہیں ہاتھ پاؤں مرے

کچھ عجب ہو رہا ہے جان کا طور
کہتی ہوں کچھ نکلتا ہے کچھ اور

آنسو آنکھوں میں بھر بھر آتے ہیں
دست و پا سارے تھرتھراتے ہیں

دل کو سمجھاتی ہوں میں بہتیرا
پر سنبھلتا نہیں ہے جی میرا

گو تو بیٹھا ہوا ہے پاس مرے
پر ٹھکانے نہیں حواس مرے

ہوش آئے ہوئے بھی جاتے ہیں
دل میں کیا کیا خیال آتے ہیں

پیش یوں فرقتِ حبیب نہ ہو
کسی دشمن کو بھی نصیب نہ ہو

دوسرا اب یہ اور ماتم ہے
سوانگ باقی بہت ہیں شب کم ہے

خاک تسکینِ جانِ زار کریں
اب وصیت کریں کہ پیار کریں

سُن کے میں نے دیا یہ اس کو جواب
دل کو میرے بس اب کرو نہ کباب

تم تو یوں اپنی جان دو مری جان
میں وصیت سنوں خدا کی شان

دل سے رکھنا ذرا یہ اپنے دور — کون کم بخت یہ کرے گا اُمور
مجھ پہ یہ دن تو کبریا نہ کرے — تم مرو میں جیوں خدا نہ کرے
جان دے دو گی تم جو کھا کر سم — میں بھی مر جاؤں گا خدا کی قسم
جو یہ دیکھے گا خوب روئے گا — آگے پیچھے جنازہ ہوئے گا
اک ذرا مجھ سے تو کہو یہ حال — جی میں کیا آیا آپ کے یہ خیال
دل ہی دل میں الم اُٹھاتی ہو — جان دیتی ہو زہر کھاتی ہو
پہونچا ماں باپ سے اگر ہے الم — اس کا کرنا نہ چاہیے تمھیں غم
جو کہ ہوتے ہیں قوم کے اشراف — یوں ہی کرتے ہیں وہ قصور معاف
کچھ تمھیں پر نہیں ہے یہ افتاد — سب کے ماں باپ ہوتے ہیں جلاد
صدمہ ہر اک پہ یہ گذرتا ہے — زہر کھا کھا کے کوئی مرتا ہے
شکوہ ماں باپ کا تو ناحق ہے — ان کا اولاد پر بڑا حق ہے
ہوں جو ناراض یہ قیامت ہے — ان کے قدموں کے نیچے جنت ہے
تم تو نام خدا سے ہو دانا — اس پہ رتبہ نہ اُن کا پہچانا
کیا بھروسا حیات کا اُن کی — نہ بُرا مانو بات کا اُن کی
ہوش رہتے نہیں ہیں اس سن کے — یہ تو مہمان ہیں کوئی دن کے
اتنی سی بات کا غبار ہے کیا — ان کے کہنے کا اعتبار ہے کیا
غور سے کیجیے جو دل میں خیال — ان کا غصہ نہیں ہے جائے ملال
سُن کے اس نے دیا یہ مجھ کو جواب — ہم نے دیکھی نہیں ہے چشم عتاب
بے حیا ایسی زندگی کو سلام — منھ پہ آئے نہ تھے کبھی یہ کلام
طعنے سنتی ہوں دو مہینے سے — موت بہتر ہے ایسے جینے سے
خونِ دل کب تلک پیے کوئی — بے حیا بن کے کیا جیے کوئی

نوج انسان بے حمیت ہو
آدمی کیا نہ جس کو غیرت ہو

بات وہ کس طرح بشر سے اُٹھے
نہ سُنی ہو کبھی جو کانوں سے

وہ سُنے جس کو اس کی عادت ہے
اس میں کیا اپنی اپنی غیرت ہے

پر مرے جیتے جی تو بہرِ خُدا
اپنے مرنے کا ذکر مُنھ پہ نہ لا

کون سا پڑ گیا ہے رنج و محن
جان کیوں دیں گے آپ کے دشمن

تم نے جی دینے کی جو کی تدبیر
حشر کے روز ہوں گی دامن گیر

تو سلامت جہاں میں رہ مری جان
نکلیں ماں باپ کے ترے ارمان

واسطے میرے اپنا دل نہ کڑھا
چاند سی بہو گھر میں بیاہ کے لا

ہے یہی لطف زندگانی کا
دیکھ سکھ اپنی تو جوانی کا

چار دن ہے یہ نالۂ و فریاد
عمر بھر کون کس کو کرتا ہے یاد

لُطف دُنیا کے جب اُٹھاؤ گے
ہم کو دو دن میں بھول جاؤ گے

تھا یہی ذکر جو بجا گھڑیال
سُنتے ہی اُس کو ہو گئی بے حال

ہو گیا فرطِ غم سے چہرہ زرد
دست و پا تھرتھرا کے ہو گئے سرد

مردنی رُخ پہ چھا گئی اس کے
دل میں وحشت سما گئی اس کے

دل میں گزرا جو اس کے صبح کا شک
ہوئی استادہ جا کے زیرِ فلک

ٹھنڈی جس دم چلی نسیم سحر
ہو گیا حال اور بھی ابتر

اتنے میں صبح کی بجی وردی
دونی چہرہ کی ہو گئی زردی

ہوئے ثابت جو صبح کے آثار
ہو گئی اور اس کی حالت زار

بید کی طرح جسم تھرّایا
سر سے لے پاؤں تک عرق آیا

باتیں کرتی جو تھیں سو بھول گئی
دم لگا چڑھنے سانس پھول گئی

بولی گھبرا کے رہیو اس کے گواہ
اور کہا لَا اِلٰہَ اِلَّا اللہ

اب فقط یہ ہے خوں بہا میرا — بخش دے جو کہا سنا میرا
کہہ کے وہ پھر چمٹ گئی اک بار — اور کیا خوب بھینچ بھینچ کے پیار
سر سے لے کر بلائیں تابقدم — بولی تم پر نثار ہوتے ہیں ہم
آگ لگ جائے وہ گھڑی کم بخت — بام پر آئی تھی میں کون سے وقت
پھر وہ بولی یہ پونچھ کر آنسو — میرے سر کی قسم نہ کڑھیو تو
آزماتی تھی تجھ کو ہنستی تھی — میں ترے چھیڑنے کو ہنستی تھی

---

کہہ کے یہ بات ہو گئی وہ سوار — یاں بندھا آنسوؤں کا آنکھ سے تار
آتشِ غم بھڑک گئی دونی — تپشِ قلب نے کی افزونی
یاد آئی تھی جب وصیتِ یار — وہم لاتا تھا دل ہزار ہزار
تھی مصیبت جو یہ بلا انگیز — دھیان آتے تھے کیا کیا وحشت خیز
دل میں کہنے کا اس کے تھا جو ملال — آتے تھے ذہن میں عجیب خیال
کون روکے گا جا کے گھر بیٹھے — جو کیا ہے وہی نہ کر بیٹھے
ہر گھڑی تھا جو اضطراب فزوں — چپکا روتا تھا بیٹھا میں محزوں
کہ اٹھا ایک سمت سے وہ غل — ہوش جس سے کہ اڑ گئے بالکل
شعلہ اک آگ کا بھڑکنے لگا — مثلِ بسمل کے دل تڑپنے لگا
یوں تو گزرے تھے دوپہر روتے — اور ہاتھوں کے اڑ گئے توتے
ہو گیا دل کو اس طرح کا ہراس — آئے سو سو طرح کے وسواس
کہا اک دوست سے کہ تم جا کر — جلد اس شور و غل کی لاؤ خبر
روتے ہیں ہم سے بدنصیب کوئی — مر گیا ان کا کیا حبیب کوئی
یوں جو اپنی یہ جان کھوتے ہیں — کون ہیں کس لیے یہ روتے ہیں
کیا ہوا ان پہ صدمۂ جانکاہ — یہ جو کرتے ہیں ایسے نالہ و آہ

دوڑے آخر ادھر مرے احباب
لے کر آئے خبر وہاں سے شتاب

کہا اس طرح آ کے مجھ سے بیاں
کہ یہاں سے ہے اک قریب مکاں

باغ کے پاس جو بنا ہے گھر
واں فروکش ہیں ایک سوداگر

یوں تو اک شور راہ بھر میں ہے
پر یہ آفت انھیں کے گھر میں ہے

صاف کھلتا نہیں ہے یہ اسرار
مر گیا کوئی یا کہ ہے بیمار

پر یہ ہوتا ہے عقل سے ادراک
کہ نہیں بے سبب اڑاتے خاک

کچھ نہ کچھ تو ہے ایسی ہی روداد
کہ ہے یہ شور نالہ و فریاد

نہیں برپا یہ بے سبب ماتم
ہے نکلتا کسی جوان کا دم

ہر بشر ہو رہا ہے دیوانہ
کوئی مرتا ہے صاحبِ خانہ

نہیں قابو میں ہے کسی کا دل
پیٹتے سر ہیں صاحبانِ محل

نہیں دیتا سنائی کچھ بالکل
ہے فقط ایک ہائے ہائے کا غل

تھمتا اک دم بھی واں خروش نہیں
کس سے پوچھیں کسی میں ہوش نہیں

روتے جس درد سے ہیں وہ اس دم
دیکھا جاتا نہیں خدا کی قسم

کہہ گئی تھی جو وہ کہ کھاؤں گی زہر
میں یہ سمجھا کہ ہو گیا وہی قہر

گو حیا سے نہ اس کا نام لیا
دونوں ہاتھوں سے دل کو تھام لیا

دوستوں نے جو دیکھی یہ صورت
بولے اس طرح از رہِ الفت

حالِ دل یوں تمھارا غیر جو ہے
مگر اس وقت کیا ہے خیر تو ہے

بے سبب کس لیے ہوئے ہو اداس
اڑ گئے کیوں تمھارے ہوش و حواس

کون سی آفت آ گئی اس دم
مردنی منہ پہ چھا گئی اس دم

کیا ہے جو اتنے بے قرار ہو اب
کوئی مر جائے تم سے کیا مطلب

ایسی حالت جو پیچ و تاب کی ہے
تم کو کیا وجہ اضطراب کی ہے

شہر میں لوگ روز مرتے ہیں ۔۔۔ خفقاں اس کا کوئی کرتے ہیں
فکر کرنا ہے اس طرح کی زبوں ۔۔۔ یوں ہی ہو جاتا ہے بشر کو جنوں
سن کے ماں باپ کیا کہیں گے بتاؤ ۔۔۔ ہوش پکڑو ذرا حواس میں آؤ
تم کو کیا ہے جو جان کھوتے ہو ۔۔۔ بے سبب آپ ہی آپ روتے ہو
ہو رہے ہو ملول کس غم سے ۔۔۔ حال دل کا کہو تو کچھ ہم سے
طعنہ آمیز دوستوں کے بیاں ۔۔۔ ہوئے معلوم نشترِ رگِ جاں
نہ دیا ان کو مارے غم کے جواب ۔۔۔ ڈھانپ کر منہ کیا بہانۂ خواب
اُٹھ گئے دوست آشنا جس دم ۔۔۔ کھول کر منہ کو چپکے اُٹھے ہم
حالِ دل سینہ میں ہوا جو تباہ ۔۔۔ بیٹھا کمرے میں آن کر سرِ راہ
دیکھا برپا ہے ایک حشر کا غُل ۔۔۔ بھیڑ سے بند راہ ہے بالکل
اُس طرف سے جو لوگ آتے ہیں ۔۔۔ یہی آپس میں کہتے جاتے ہیں

---

حال ان کا بھی جائے رقت ہے ۔۔۔ داغ اولاد کا قیامت ہے
نوچ ڈالے ہیں سارے سر کے بال ۔۔۔ کیا پریشاں ہے والدین کا حال
آفتِ تازہ سر پہ ہے آئی ۔۔۔ بک رہے ہیں مثال سودائی
دھیان ان کی طرف جو جاتا ہے ۔۔۔ غم سے مُنھ کو کلیجہ آتا ہے
جو کہ تھے ان میں صاحبِ اولاد ۔۔۔ حال ابتر تھا ان کا حد سے زیاد
کہتے تھے پیٹ کر سر و سینہ ۔۔۔ کیوں نہ دشوار ان کو ہو جینا
مرگ اولاد کا وہ ماتم ہے ۔۔۔ رنج و غم جس قدر کریں کم ہے
کوئی کہتا تھا کیسی آفت ہے ۔۔۔ نوجواں مرنا بھی قیامت ہے
یوں تو ہے ازپئے زمانہ مرگ ۔۔۔ نہ مرے پہ کوئی جوانہ مرگ

کوئی بولا کہ ہے سبھی کو ملال — دیکھا جاتا نہیں یہ باپ کا حال
آتشِ غم سے دل ہوا ہے کباب — ہے تپاں مثلِ ماہیِ بے آب
چشمہ جاری ہے چشمِ گریاں کا — ہوش باقی نہیں تن و جاں کا
نہیں دم بھر کسی کو واں آرام — دیکھنے والے رو رہے ہیں تمام
پھوڑ ڈالے ہیں سب نے سر اپنے — سر و پا کی نہیں خبر اپنے
بنئے بقّال جان کھوتے ہیں — سارے دوکان دار روتے ہیں
حال دیکھا جو میں نے یہ اُٹھ کر — ہل گیا سینے میں دلِ مُضطر
نہ رہی تاب رنج کے مارے — لگے تھرّانے دست و پا سارے
بحرِ اُلفت نے دل میں مارا جوش — گر پڑا ہو کے خاک پر بے ہوش
عشق کی تھی جو دل کو بیماری — غش کا عالم سا ہو گیا طاری
دو گھڑی بعد پھر جو آیا ہوش — دیکھا برپا عجب ہے جوش و خروش

---

آگے آگے ہے کچھ جلوس رواں — سر کھلے پیچھے کچھ ہیں پیر و جواں
سن رسیدہ ہیں عورتیں کچھ ساتھ — سینہ و سر پہ مارتی ہیں ہاتھ
کوئی ماما ہے کوئی دائی ہے — کوئی انّا کوئی کھِلائی ہے
جب وہ بھرتی ہیں غم سے آہِ سرد — سُننے والوں کے دل میں ہوتا ہے درد
ہوتا غیروں کو ہے ملال اُن کا — دیکھا جاتا نہیں ہے حال اُن کا
کچھ بیاں ایسے ہوتے جاتے ہیں — راستے والے روتے جاتے ہیں
اس کے پیچھے پڑی پھر اس پہ نگاہ — کہ نہ دیکھے بشر معاذاللہ
شامیانہ نیا زری کا ہے — نیچے تابوت اس پری کا ہے
سہرا اس پہ بندھا ہے اک زرتار — جیسے گلشن کی آخری ہو بہار

تھی پڑی اُس پہ ایک چادرِ گُل — جس سے خوشبو نکلتی تھی بالکل
عود سوز آگے آگے روشن تھے — مرگئے پر بھی لاکھ جوبن تھے
بھیڑ تابوت کے تھی ایسی ساتھ — جیسے آئے کسی دُلھن کی برات
سب وضیع و شریف تھے ہمراہ — بھیڑ تھی اس قدر کہ تنگ تھی راہ
ساتھ تھے خویش و اقربا سارے — رو رہے تھے غریب بیچارے
پیچھے پیچھے تھا سب کے سوداگر — مو پریشاں، اُداس، خاک بسر
آگے آگے جنازہ جاتا تھا — غش اُسے ہر قدم پہ آتا تھا
ہاتھ تھامے تھے اقربا سارے — تا کسی جا پہ سر نہ دے مارے
حال اس درجہ ہو رہا تھا زبوں — بہتا جاتا تھا سر کے زخم سے خوں
سب امیر و فقیر روتے تھے — دیکھ کر راہ گیر روتے تھے
پیچھے سب کے فنس میں تھی مادر — کہتی جاتی تھی اس طرح رو کر
تیری میت پہ ہو گئی میں نثار — کم سخن ہائے میری غیرت دار
دل پہ جو گزری کچھ بیان نہ کی — کچھ وصیت بھی میری جان نہ کی
کچھ نہیں ماں کی اب خبر تم کو — کس کی یہ کھا گئی نظر تم کو
دل ضعیفی میں میرا توڑ گئیں — بیٹا اس ماں کو کس پہ چھوڑ گئیں
تازہ پیدا جگر پہ داغ ہوا — گھر مرا آج بے چراغ ہوا
دل کو ہاتھوں سے کوئی ملتا ہے — جی سنبھالے نہیں سنبھلتا ہے
زہر دے دے کوئی میں کھا جاؤں — یا زمیں شق ہو میں سما جاؤں
داغ تیرا جگر جلاتا ہے — چاند سا مکھڑا یاد آتا ہے
مٹ گیا لطف زندگانی کا — دل کو غم ہے تری جوانی کا
بیاہ تیرا رچانے پائی نہ میں — کوئی منت بڑھانے پائی نہ میں

تیری صورت کے ہو گئی قرباں
چلیں دُنیا سے کیسی پُر ارماں

ہوئیں کس بات پر خفا بولو
اماں داری ذرا جواب تو دو

بولتیں تم نہیں پکارے سے
اب جیوں گی میں کس سہارے سے

کیا قضا نے جگر پہ داغ دیا
آج گھر میرا بے چراغ کیا

نکلا ماں باپ کا نہ کچھ ارماں
ہائے بیٹی نہ تم چڑھیں پرواں

ایسی اس ماں سے ہو گئیں بیزار
لی نہ خدمت بھی پڑ کے کچھ بیمار

نہ جیوں گی ترے فراق میں مَیں
دل تڑپتا ہے آنکھیں ڈھونڈتی ہیں

کس مصیبت میں پڑ گئی بیٹا
کوکھ میری اُجڑ گئی بیٹا

عمر کٹتی تھی ایسے صدمے میں
ٹھوکریں تھیں بدی بڑھاپے میں

سن کے اس طرح اس کی ماں کے بین
اور سینے میں دل ہوا بے چین

تھی وصیت جو اس پری کی یاد
سب کے پیچھے میں ہو لیا ناشاد

گو یہ طاقت نہ تھی کہ چلتا راہ
لے چلا جذب عشق پر ہمراہ

پیچھے ان سب کے جو رواں تھا میں
صورت گرد کارواں تھا میں

گہ تڑپتا تھا صورتِ بسمل
بیٹھ جاتا تھا گاہ تھام کے دل

جوں جوں کرتا تھا ضبط میں نالا
ہوا جاتا تھا دل تہ و بالا

مرغ بسمل کی میری صورت تھی
یاں گرا واں گرا یہ حالت تھی

الغرض پہونچا ساتھ اُن کے وہاں
دفن کا اس کے تھا مقام جہاں

قبر کھُدتی جو واں نظر آئی
لاکھ روکا یہ چشم بھر آئی

دیکھ کر یہ جو لوگ رونے لگے
ٹکڑے ٹکڑے جگر کے ہونے لگے

طاقتِ ضبط گریہ جب نہ رہی
دل سے اپنے میں نے بات کہی

کہہ کے کیا مر گئی وہ جان تجھے
کچھ وصیت کا بھی ہے دھیان تجھے

ہو نہ للہ بے قرار اتنا    ضبط کر نالہ ہو سکے جتنا
دل کو سمجھا کے یہ گیا میں وہاں    جمع سب اس کے اقربا تھے جہاں
دلِ آفت زدہ کو بہلا کر    چپکا بیٹھا میں اس طرف جا کر
اشک آنکھوں سے گو نہ بہتے تھے    لوگ پر دیکھ کر یہ کہتے تھے
حال چہرے کا آج کیسا ہے؟    خیر تو ہے مزاج کیسا ہے؟
لال آنکھیں ہیں تمتمائے ہیں گال    وجہ کیا ہے بیان کیجے حال
منھ پہ اک مردنی سی چھائی ہے    چہرے پر چھٹ رہی ہوائی ہے
بولا میں اور کچھ نہیں ہے بات    شب کو سویا نہیں میں ساری رات
اس پہ پیدل جو آیا میں مجبور    رنگ چہرے کا ہو گیا کافور
ترک عادت بھی اک عداوت ہے    رات کا جاگنا قیامت ہے
دل کا شک اُن کے سب نکال دیا    یہی کہہ سُن کے اُن کو ٹال دیا
غل ہوا اتنے میں سب آتے جائیں    فاتحہ پڑھتے جائیں جاتے جائیں
سُن کے یہ سب گئے وہاں احباب    بخشا پڑھ پڑھ کے فاتحہ کا ثواب
جب کہ اس سے بھی ہو گئی فرصت    آئے جتنے تھے ہو گئے رخصت
پائی تنہا جو میں نے یار کی قبر    دل کو باقی رہی نہ طاقتِ صبر
تھا جو اس شمع رو کا دیوانہ    دوڑ کر آیا مثلِ پروانہ
گر پڑا آ کے قبر پر اک بار    اور رونے لگا میں زار و قطار
نہ رہا تھا جو اختیار میں دل    لوٹا تربت پہ صورتِ بسمل

---

مر گئی تھی جو مجھ پہ وہ گلفام    زندگی ہو گئی مجھے بھی حرام
دیکھا آنکھوں سے تھا جو ایسا قہر    کھا گیا میں بھی گھر میں آ کر زہر

دو پہر تک تو قے رہی جاری — بعد اس کے غشی ہوئی طاری
تین دن تک رہی وہ بے ہوشی — ہو گئی جس سے خود فراموشی
عین غفلت میں پھر یہ دیکھا خواب — کہ یہ کہتی ہے وہ بہ چشم عتاب
سُن تو رے تو نے زہر کیوں کھایا — کچھ وصیت کا بھی نہ پاس آیا
ہوئے خود رفتہ ایسے حد سے زیاد — دو ہی دن میں بھلا دی میری یاد
دل سے میرا بُھلا دیا کہنا — ہاں یہی چاہیے تھا کیا کہنا
کہہ کے یہ جب وہ ہو گئی روپوش — کھُل گئی آنکھ۔ آگیا مجھے ہوش
زہر کا پھر نہ کچھ اثر پایا — اک تعجب سا مجھ کو یہ آیا
آشنا دوست سب کا تھا یہ بیان — مُردے بھی جی اُٹھے خدا کی شان
ہو گیا والدین کو یہ سُرور — بڑھ گیا دل کا چین چشم کا نور
اقربا سُن کے ہو گئے دل شاد — آ کے دینے لگے مبارک باد
حاصل اتنا تھا اس کہانی سے — ہم رہے جیتے سخت جانی سے

عشق میں ہم نے یہ کمائی کی
دل دیا غم سے آشنائی کی